دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا علمی و دینی مجلہ
ماہنامہ
الحق
زیر سرپرستی
شیخ الحدیث حضرۃ مولانا عبدالحق بانی و مہتمم دارالعلوم حقا
اکوڑہ خٹک ضلع پشاور
مغربی پاکستان
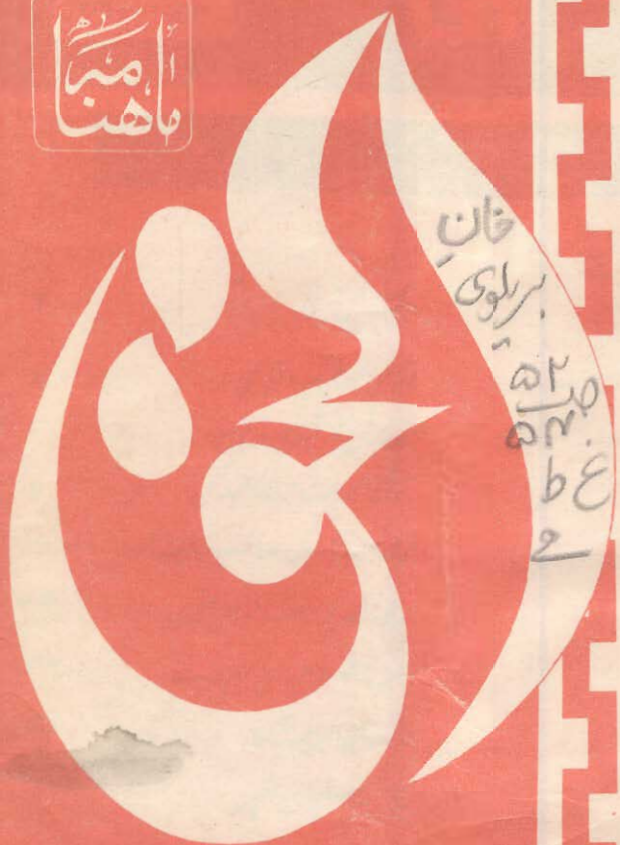
تبلیغی اور دعوتی جہاد

اگر آپ الحق کی دینی اور علمی افادیت محسوس کرتے ہیں، تو اس آوازۂ حق کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے میں ہماری مدد فرمائیں۔ آپ کے تعاون ہی سے الحق بہت جلد اپنے بلند معیار تک پہنچ سکتا ہے

الحق

کا استحکام اور اسکا فروغ، تعلیمات کتاب وسنت، کلمۂ حق، دینِ قیم اور نوامیسِ اسلام کا فروغ ؛

اگر آپ اس دینی اور تبلیغی جہاد میں براہ راست شریک ہونا چاہتے ہیں تو آئیے اپنے بھرپور تعاون سے الحق کی سرپرستی کیجئے

- اپنے حلقۂ اثر و رسوخ سے الحق کیلئے خریدار بہم پہنچائیے۔
- دینی درد اور تڑپ رکھنے والے دوستوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں الحق سے روشناس کرائیے۔
- اپنی طرف سے نادار طلبہ، دینی اداروں، تعلیمی مراکز، لائبریریوں بالخصوص باطل نظریات سے متاثر افراد کے نام الحق جاری کرائیے۔ الحق مہینہ بھر کی فکری اور علمی کاوشوں کا مرقع ہوتا ہے۔ آپ گھر بیٹھے اس تمام تبلیغی محنت میں برابر کے شریک ہوں گے۔
- اگر آپکے نام الحق جاری ہے۔ اور آپ نے زر اشتراک ابھی تک نہیں بھیجا تو جلد ارسال فرمائیے۔
- اگر آپ کسی تجارتی فرم کے مالک ہیں تو خود ورنہ اپنے زیر اثر حضرات سے الحق کیلئے اشتہارات مہیا فرمائیے
- اپنے شہر میں کسی موزوں و دیانتدار شخص کے ہاں الحق کی ایجنسی قائم کروائیے۔
- اپنے امدادی عطیات سے الحق کو زیادہ سے زیادہ ظاہری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ہونے کا موقع دیجئے۔

اس پرفتن دور میں الحق دعوت حق کی ایک قندیل اور استیصال باطل کا ایک محاذ ہے۔ اس کے فروغ اور استحکام میں آپکی کوئی سعی انشاء اللہ رائیگاں نہ ہوگی۔ اور آپ بارگاہ ایزدی سے اجر و تحسین کے مستحق ہوں گے ———۔

——— ناظم الحق

اے بی سی (آڈٹ بیورو آف سرکولیشن) کی مصدقہ اشاعت

لہٗ دعوۃ الحق

فون نمبر دارالعلوم ـــ ۴ | قرآن وسنت کی تعلیمات کا علمبردار | فون نمبر رہائش ـــ ۲

جلد نمبر : ۱۲
شمارہ نمبر : ۱

ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک

شوال المکرم ۱۳۹۶ھ
اکتوبر ۱۹۷۶ء

اس شمارے میں

مدیر : سمیع الحق

بدل اشتراک

پاکستان میں سالانہ پندرہ روپے۔ فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

بیرون ملک بحری ڈاک ایک پونڈ ، ہوائی ڈاک دو پونڈ۔

سمیع الحق استاذ دارالعلوم حقانیہ نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فقیہ العصر مفسّر قرآن مفتی اعظم مولانا محمد شفیع کی وفات

۵-۶ اکتوبر ۱۹۷۶ء کی درمیانی شب کو کراچی میں علم و فضل کا ایک ایسا آفتاب و ماہتاب غروب ہو گیا جسکی ضیاء باریوں سے پون صدی تک برصغیر کی علمی دنیا مستنیر ہوتی رہی علم و عرفان کی وہ بساط اُجڑ گئی جو قیامِ پاکستان کے بعد کراچی جیسے صنعتی اور مادی مرکز میں علمی اور روحانی سیرابی کا سامان بنی رہی۔

اسلاف کے کاروانِ علم و فضل کے فردِ فرید، دنیائے فقہ و شریعت کے گوہرِ تابندہ، فقیہ الملّۃ، مفسّر عصر، محققِ بے بدل مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ واصل بحق ہوئے۔ وقعت الواقعۃ، فانّا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت مفتی صاحب کے ہم مشرب بزرگ علامہ سلیمان ندویؒ نے اپنے مرشد حکیم الامۃ تھانویؒ کے وصال پر کہا تھا ؎

اے دلِ خموش صبر و رضا کا مقام ہے — نقشِ دوامِ فیض مٹایا نہ جائے گا۔

اور آخر میں مقطع تھا کہ ؎

چاہا خدا نے تو تری محفل کا ہر چراغ — یونہی جلا کرے گا بجھایا نہ جائے گا۔

آج بزمِ اشرفؒ کی محفلِ دوشین کا چراغ خموش ہو گیا ہے مگر اس کی ضو فشانیاں قائم رہیں گی! اور اس چراغِ علم و عرفان کی فیوض خیر و برکت کا چراغ جلتا رہے گا ــــ حضرت مفتی صاحب مرحوم کی دینی و علمی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ ایک کم سواد غم زدہ اپنے تعزیتی کلمات میں کسی ایک گوشہ کا بھی احاطہ نہیں کر سکتا۔ حضرت کی ذات شریعت و طریقت کا سنگم اور علم و معرفت کا مجمع البحرین تھی۔ وہ اکابر دیوبند کے اس سلسلۃ الذھب کی ایک کڑی تھے، جنہیں دیکھ کر اللہ یاد آتا اور جن کے وجود سے زمین کی نمکینی قائم رہتی ہے۔ اور جن میں سے ایک ہستی علامہ انور شاہ کشمیریؒ کو دیکھ کر عالمِ اسلام کے مشہور فاضل علامہ رشید رضا مصری نے کہا تھا: واللّٰہ ما رأیت مثلہ ھذا قط۔ (واللہ میں نے ان جیسا شخص کبھی نہیں دیکھا۔) اور ان اکابر کے مادرِ علمی دیوبند کی عظمت تو ایسی ان کے دل پر نقش ہوئی کہ فرمایا: لولم اراھا لرجعت من الھند حزیناً۔ (اگر میں دیوبند کو نہ دیکھ چکا ہوتا تو ہندوستان سے غمگین جاتا) حضرت مفتی صاحبؒ کو ان اسلاف کا علم و عمل، زہد و تقویٰ، تبحّر اور جامعیت ورثہ میں ملی، انہوں نے اس

وراثت کو اخیر دم تک سینہ سے لگائے رکھا، اور جاتے وقت یہ امانت اپنے اخلاف کے سپرد کردی

اھیم بلیلیٰ ماحییتُ وان امت اوکّل بلیلیٰ من یھیم بھا بعدی

حضرت مرحوم ۱۳۱۴ھ میں دیوبند میں پیدا ہوئے تعلیم وتربیت کے مراحل مرکز علوم اسلامیہ دارالعلوم میں وقت کے ممتاز علماء سے طے کئے۔ ۱۳۳۵ھ میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد قیام پاکستان تک دارالعلوم دیوبند میں افتاء وتدریس اور تصنیف وتالیف کی خدمات جلیلہ میں مشغول رہے، اس دور میں آپ نے قادیانیت کے خلاف اپنے استاذ مولانا کشمیریؒ کی رہنمائی ورفاقت میں علمی وقلمی محاذ پہ عظیم الشان جہاد کیا۔ اور ختم نبوت کے موضوع پر اسلامی علم کلام وعقائد میں بہترین اضافہ کیا۔ بیعت اولاً حضرت شیخ الہندؒ سے فرمائی ان کے وصال کے بعد ۱۳۴۲ھ یا ۱۳۴۳ھ میں حضرت حکیم الامتؒ سے تجدید بیعت کی اور ایسا ربط وتعلق ان سے استوار ہوا کہ ان ہی کے ہو کر رہ گئے اور تحریک آزادی کے سیاسی ہنگاموں میں بھی ان سے رہنمائی لیتے رہے۔ حضرت حکیم الامت کو علمی کاموں میں آپ پر اتنا اعتماد تھا کہ اکثر تصنیفی اور تحقیقی کاموں میں انہیں اپنا شریک کار بنایا اور جو کام حضرۃ حکیم الامتؒ بوجہ ضعف یا مشاغل خود نہ کر سکتے ان کی تکمیل آپ سے کرائی مثلاً حیلہ ناجزہ اور احکام القرآن جیسی علمی اور تحقیقی خدمات آپ سے کروائیں حضرت حکیم الامتؒ کے فقہی، تفسیری اور تحقیقی خدمات کا رنگ آپ کے خلفاء میں حضرت مفتی صاحبؒ پہ بہت گہرا رہا حضرت مفتی صاحبؒ کا خاص وصف فتویٰ نویسی بھی رہا ہر فتویٰ فقہی جزئیات کی تتبع واستقصاء اور اصول و جزئیات پہ گہرے نظر کا غماز ہوتا عصر حاضر کی علمی مشکلات اور حوادث ونوازل کے پیچیدہ مسائل میں علماء اجلہ بھی آپ ہی کیطرف رجوع فرماتے، یہاں تک کہ خود حضرت حکیم الامتؒ نے کئی بار ذاتی معاملات میں حضرت مفتی صاحبؒ سے استصواب فرما کر اس پر عمل کیا۔ ایسے ہی ایک فتویٰ کے جواب میں حکیم الامۃ مولانا تھانویؒ نے انہیں لکھا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میرے بعد بھی کام کرنیوالے موجود ہیں، ہزارہا ہزار فتاویٰ کے علاوہ علوم اسلامیہ قرآن وحدیث، تفسیر وفقہ۔ کلام وعقائد، شعر وادب، قانون وسیاست، معاشیات و معاشرت کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس پر آپ نے گرانقدر تصانیف نہ چھوڑی ہوں۔ اخیر عمر میں ضعف وعلالت کے باوجود معارف القرآن کے نام سے وہ عظیم الشان تفسیر مکمل فرمائی جس نے پہلی بار اردو زبان میں ایک بڑی خلاء کو پُر کردیا۔ تصنیف وتالیف کے ساتھ ساتھ روحانی اصلاح وتربیت کا سلسلہ بھی جاری رکھا، اصابت رائے، تدین وتقویٰ، ضبط ونظم اور سب سے بڑھ کر تواضع وانکساری اور تحمل وشفقت میں وہ اکابر کی تصویر تھے، اسی افتاد طبع کی بناء پر وہ منکرات کے مقابلہ اور ارباب اقتدار پر تنقید میں بھی مقابلے اور مجادلے کی بجائے داعیانہ اور حکیمانہ طریق کار پسند فرماتے اور خاموشی سے اصلاح احوال میں کوشاں رہتے، اسی انداز میں آپ نے صدر ایوب کو حکمت وموعظت سے خطوط لکھے اور اسی انداز میں صدر یحییٰ کو مراسلات کے ذریعہ متوجہ کیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد جس کے قیام میں آپ کا بھی حصہ تھا (اور اس باب میں آپ اپنے مرشد حکیم الامۃ تھانویؒ اور اپنے استاذ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے ہمنوا اور شریکِ کار رہے۔) آپ نے پاکستان میں شریعتِ اسلامی کے نفاذ کی بھرپور کوشش کی قراردادِ مقاصد کی تکمیل میں آپ کا اہم حصہ تھا پھر ہر اہم موقعہ پر سیاسی میدان میں اپنی حد تک اصلاحِ احوال کی سعی فرماتے رہے، مگر قول و عمل میں سیاسی زعماء کی منافقت اور ان کے پرفریب اسلامی دعوؤں کے تسلسل نے بالآخر آپ کو مایوس کر دیا اور خارزارِ سیاست سے کنارہ کش ہو کر علمی و دینی خدمات میں مصروف ہو گئے جو ان کے ذوق و انہماک کا اصل میدان تھا۔ ان کے صدقاتِ جاریہ میں کراچی کا مشہور دارالعلوم بھی ہے جنہیں آپ نے ایک عظیم مرکز بنا کے چھوڑا اور اخلاف میں ہزاروں متوسلین کے علاوہ ان کے قابلِ فخر صاحبزادگان بالخصوص برادرِ گرامی مرتبت مولانا محمد تقی عثمانی مدیر البلاغ جو ان کے لئے سرمایۂ خیر ہیں اور جنہیں خدا نے حضرت مفتی صاحب کے کمالات و صفات سے وافر حصہ دیا ہے۔ اپنے والدِ بزرگوار سے نہایت گہرے ذہنی و علمی تعلق نے یہ سانحہ ان کے لئے اور بھی شدید بنا دیا ہے، اور اس عاجز سے برادرِ موصوف کا جو تعلق اخوۃ و وداد ہے اس بنا پر یہ سانحہ فاجعہ تو میرے لئے بھی ذاتی نوعیت کا بن گیا ہے۔ اور میں خود مستحقِ تعزیت بن چکا ہوں۔ اب ان سے تعزیت کروں بھی تو کن الفاظ میں، اور کروں بھی تو کیونکر، کہ اسے موہم اجنبیت سمجھتا ہوں۔

دارالعلوم حقانیہ سے حضرت مفتی صاحب کا جو تعلق خاطر رہا اور اس کے بانی اور شیخ الحدیث مدظلہٗ سے زمانہ قیامِ دیوبند کے رشتۂ تعلیم و تدریس میں اشتراک ان سب باتوں نے بھی دارالعلوم حقانیہ اور الحق کو شریکِ غم بنا دیا ہے اور دارالعلوم اپنے تمام طلباء و اساتذہ کے ساتھ ایصالِ ثواب اور دعائے رفعِ درجات میں پوری ملتِ مسلمہ کا شریک ہے۔

★

بنگلہ دیش کے چمنستانِ علم میں خزاں

یہ عجیب سوءِ اتفاق ہے کہ مغرب میں آفتابِ علم مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی شکل میں غروب ہوا تو اسی رات پاکستان کا وہ مرحوم حصہ جو کبھی مشرقی کہلاتا تھا، اپنے ہاں کے ایک آفتابِ رشد و ہدایت مولانا اطہر علی خان جامعہ امدادیہ کشورگنج کے احباب سے محروم ہو گیا اور انہی ایام کے لگ بھگ بنگلہ دیش کے کئی ایک اور اکابرِ علم و فضل حضرۃ مولانا عبدالوہاب صاحب اور چاٹگام کے مولانا مفتی فیض اللہ صاحب وغیرہ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ایسے تیزی سے علم و فضل کے قافلوں کا دنیائے فانی سے کوچ کر جانا دنیا کے حق میں اچھی علامت نہیں، قبضِ علماء کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اشراطِ ساعت میں سے قرار دیا ہے۔ جانے والوں کی مسندیں خالی ہوتی جا رہی ہیں اور امت کی اکثریت "محوِ نالۂ جرسِ کارواں" ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری حالت پر رحم فرمائے اور ملتِ مرحومہ کو مرحومین کی برکتوں سے مالا مال رکھے۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

سمیع الحق
۲۵ر شوال ۱۳۹۶ھ

قاری محمد طیب قاسمی کے تاثرات

ناظم دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند۔ انڈیا

دارالعلوم دیوبند میں

مفتیٔ اعظم مولانا محمد شفیع رحمہ کا سوگ

دیوبند۔ ۶ اکتوبر کی صبح کو پاکستان ریڈیو سے یہ المناک خبر سن کر کہ آج شب میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان نے داعی اجل کو لبیک کہا، دارالعلوم دیوبند کے علمی حلقے میں رنج وغم کے گہرے بادل چھا گئے ـــ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ العالی مہتمم دارالعلوم دیوبند پر اس حادثۂ فاجعہ کا سب سے زیادہ اثر تھا۔ حضرت مفتی صاحب حضرت مہتمم صاحب کے معاصر اور تعلیمی زمانے کے ساتھی تھے۔ ایک ساتھ دونوں نے پڑھا، ایک ساتھ حج کیا، ایک ہی ادارہ میں رہے۔ حضرت مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند کے عظیم فرزند تھے۔

مدتوں دارالعلوم دیوبند میں حدیث و فقہ کے استاد اور صدر مفتی کے منصب جلیلہ پر فائز رہے۔ وہ سینکڑوں کتابوں کے مصنف تھے، تفسیر میں تفسیر معارف القرآن ان کا عظیم کارنامہ ہے، تقسیم ملک کے بعد حضرت مفتی صاحب پاکستان تشریف لے گئے۔ وہاں کراچی میں دارالعلوم کے نام سے علوم دینیہ کی ایک بڑی درسگاہ قائم فرمائی۔ حضرت مفتی صاحب پاکستان میں مسلک دیوبند کے عظیم داعی اور ترجمان تھے، انہیں حضرت تھانویؒ سے خلافت حاصل تھی اور ان کے اجلۂ خلفاء میں تھے۔ مفتی صاحب کی ایک منفرد خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے وقت کے ہر اہم حادثے پر قلم اٹھایا ہے اور اس میں تحقیق و افتاء کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کا درجہ حضرت تھانویؒ کی نگاہ میں ایسا تھا کہ وہ ان کی تحقیق اور علم پر کلیتاً اعتماد فرماتے تھے اور حضرت نے بہت سے مسائل پر مفتی صاحب سے مضامین مرتب کرائے، ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اسلاف کا ذوق ان میں پوری طرح رچا بسا تھا۔ اور جزئی مسئلہ میں بزرگوں کے اتباع کو ضروری سمجھتے تھے۔ مفتی صاحب اگرچہ آج ہم میں نہیں ہیں مگر ان کا علم اور ان کی دینی خدمات زندہ ہیں اور زندہ رہیں گی اور اس سے ان کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی دارالعلوم دیوبند میں حضرۃ مفتی صاحب کی وفات کی خبر معلوم ہونے پر فوراً کلمہ طیبہ اور قرآن کریم کا ختم کرا کر ایصال ثواب کرایا گیا ختم کے بعد حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے اپنی تعزیتی تقریر میں حضرۃ مفتی صاحب کے محاسن و کمالات بیان کرتے ہوئے انہیں دارالعلوم کے جوہر فرد سے تعبیر فرمایا، انہوں نے فرمایا کہ مفتی صاحب کے انتقال کی اطلاع سننے سے پہلے میں نے اسی شب میں یہ خواب دیکھا کہ کسی نے آکر یہ خبر دی کہ جنازہ تیار ہے اور بس آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ جس سے میں یہ سمجھا کہ ا[illegible] کوئی متعارف شخصیت ہے جس کیلئے یہ بھی بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ کس کا جنازہ ہے حتیٰ کہ انتقال کی خبر سنتے ہی میری زبان پر یہ آیت کریمہ بے ساختہ جاری ہو گئی۔ لهم درجات عند ربهم ومغفرة ورزق كريم۔ آخر میں حضرۃ مفتی صاحب کے لئے دعائے مغفرت کی گئی۔ ایصال ثواب کی غرض سے دارالعلوم دیوبند میں دو دن کی تعطیل کی گئی۔

مؤتمر المصنّفین کی ایک اور پیشکش

قومی اسمبلی میں

اسلام کا معرکہ

شیخ الحدیث مولانا عبد الحق مدظلہ کی سرگرمیاں

؎ صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب اقبالؒ

قومی اسمبلی میں جمہوری قومی وملّی مسائل پر قراردادیں مباحثات۔ پارلیمنٹ میں موجودہ سیاسی پارٹیوں کا موقف، حزب اختلاف اور حزب اقتدار کا اسلامی وملّی مسائل کے بارہ میں روّیہ، شیخ الحدیث کی تقاریر، اور ان کی قراردادوں پر ارکان اسمبلی کا ردّ عمل ـــ آئین کو اسلامی اور جمہوری بنانے کی جدوجہد پر کیا گذری، تحاریک التواء، سوالات اور جوابات، مسوّدہ دستور میں ترمیمات اور تشریحی تقریریں۔

سیاستدانوں کے منشور اور انتخابی وعدے کردار کی کسوٹی پر۔

ایک اہم سیاسی دستاویز۔

ایک آئینہ اور ایک اعمالنامہ

ایک ایسی رپورٹ جو اسمبلی کے شائع کردہ سرکاری رپورٹ کے حوالوں سے بھی مستند ہے۔

پاکستان کے مرحلہ آئین سازی کی ایک تاریخی داستان اور ایک ایسی کتاب جس سے وکلاء، سیاستدان بھی اور اسلامی سیاست میں منہمک افراد اور جماعتیں بھی بے نیاز نہیں ہو سکتیں۔

ایک ایسی کتاب جو جہاد حق اور غلبۂ اسلام کے علمبردار علماء کیلئے حجت وبرہان بھی ہے۔ اور مستقبل میں اسلامی جدوجہد میں رہنما بھی ـــ کتاب شائع ہو چکی ہے اور ترسیل جاری ہے۔

عمدہ کتابت وطباعت حسین سرورق، قیمت پندرہ روپے۔ صفحات ۸۰۰

مؤتمر المصنّفین اکوڑہ خٹک (پشاور)

دعوات عبدیت حق
ضبط و ترتیب ـــــ ادارۂ الحق

ارشادات حضرۃ شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ

اجتماعی مرض اور اسکا علاج

خطبۂ عید الفطر ۱۳۹۶ھ

علالت کی وجہ سے ایک عرصہ کے بعد یکم شوال ۱۳۹۶ بروز ہفتہ مطابق ۲۵ ستمبر ۱۹۷۶ء عید گاہ اکوڑہ خٹک میں نمازِ عید سے قبل حضرت شیخ الحدیث مدظلہ نے حسب ذیل خطاب فرمایا۔ پورے اکوڑہ خٹک میں مدت مدید سے صرف ایک ہی جگہ نمازِ عید ہوتی ہے۔ اس وقت بھی قصبہ اور آس پاس سے حاضرین کی تعداد ۱۵ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ " ادارہ "

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ توبوا الی اللہ جمیعًا ایھا المومنون۔

میرے بزرگو! بیماری اور ضعف کی وجہ سے میری آواز شاید آپ تک نہ پہنچ سکے۔ ہم اور آپ سب ایک ایسی کشتی میں سوار ہیں کہ اس کا نہ ملاح ہے نہ چپّو درست ہیں، نہ رسّیاں ٹھیک ہیں۔

میرے بھائیو! آج ہماری ہر ادا ایک مرض ہے۔ یعنی سنّت کے خلاف شریعت کے خلاف، ہماری ہر رائے ہمیں باطل کیطرف کھینچ رہی ہے۔ تو اب ہم روئیں تو کس کس بات پر؟ اور شکوہ کریں تو کس کس بات کا۔؟ ع تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

آج اپنوں سے ہمارا مقابلہ ہے، پرایوں سے ہماری دشمنی ہے۔ کیونکہ ہم بڑے بہادر ہیں جتنا بھی کوئی اپنا ہے اتنی اُس سے دشمنی ہے۔ بھائی بھائی کا دشمن ہے۔ پھر چچازاد بھائی دشمن ہے۔ پھر عزیز و اقارب دشمن ہیں، پھر محلہ والوں سے دشمنی ہے۔ پھر گاؤں کے باشندوں سے دشمنی ہے۔ پھر ملک کے مسلمانوں سے دشمنی ہے۔ بڑے پشتون بنے پھرتے ہیں اور پشتون پشتون کا دشمن ہے۔ پشتون ہونے کی بات پر یاد آیا حضرت موسیٰ کوہ طور پر تشریف لے جا رہے ہیں۔ اللہ جل مجدہٗ سے راز و نیاز کرنا ہے۔ تو ایک جگہ ابلیس سامنے آیا، کہا صاحب آپ تو نبی ہیں ـــــ بھائیو! پیغمبر کا وجود تو رحمت ہوتا ہے۔ خصوصاً

اولیاء بھی اور ہر قسم کی قومیں ہوں گی۔ تو اللہ تعالیٰ کو اپنے حبیب نبی کریم کی شان دکھانی منظور ہو گی، تو ایک وفد اقوام سے مرتب ہو کر انبیاء کرام کے پاس جائے گا کہ ہَول محشر سے نجات ملے اور جلد حساب شروع ہو اور یہ ایسا ہے کہ کسی کو تنہائی میں مار پیٹ لو، گالی گلوچ بھی دیدو تو برداشت کر لیتا ہے۔ مگر کسی مجمع میں بازار میں لوگوں کے سامنے اس کا جرم ظاہر ہو تو ذلیل ہوتا ہے کہ اب لوگوں کے سامنے عزت گئی تو اب سارے لوگوں کے سامنے مجرموں کا پردہ اٹھے گا، چور نے چوری کا مال اٹھایا ہو گا۔ بکری چوری کی تو سر پر ہے۔ کپڑا چرایا تو اس کا جھنڈا پشت پر لہرا رہا ہے۔ جیسے آجکل عدالت میں چوری کا سامان بھی چور کے ساتھ کبھی کبھی پیش کیا جاتا ہے۔ تو یہاں دنیا میں تو اللہ تعالیٰ نے ہر شخص پہ پردہ ڈالا ہوا ہے۔ آپ لوگوں کو معلوم نہیں کہ میں کتنا گنہ گار ہوں۔ پردہ اللہ نے ڈالا ہے تو مولوی اور مولانا کہتے ہو وہاں ایسا نہ ہو گا۔ یوم تبلیٰ السرائر۔ چوری کا مال ظاہر ہو گا زمین غصب کی تو وہ گلے کا طوق ہو گی۔ ووجدوا ما عملوا حاضرا۔ اگر زنا کیا تو زانیہ سر پہ بیٹھی ہو گی۔ ووجدوا ما عملوا حاضرا۔ جو کچھ عمل کیا ہو گا اُسے وہاں حاضر پائیں گے۔

—— تو قیامت کا دن بہت سخت ہے۔ کافروں کو بھی معلوم ہے۔ کہ قیامت کے دن ایک دوسرے کی حقیقت سب پر ظاہر ہو جائے گی، شیخی، ملائی سب وہاں ختم ہو جائے گی۔ یہ چور ہے۔ یہ زانی ہے۔ یہ جوا باز ہے۔ اس نے گالی گلوچ کی ہے۔ تو سب کے سامنے یہ رسوائی سب کے لئے ایک بہت بڑا عذاب ہو گی، اور سب چاہیں گے کہ جلدی حساب شروع ہو اور اس مجمع سے الگ ہو جائیں تو وفد جا کر ہر نبی سے درخواست کرے گا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حساب شروع کرنے کی سفارش کر دے، مقدمہ چل پڑے یہ شفاعت کبریٰ ہے، تو ہر نبی کہے گا کہ —— ان ربی غضب الیوم غضباً۔ آج ہمارا رب جلال اور غضب میں ہے اور اتنے جلال میں ہمیں شرم آتی ہے کہ سفارش کریں۔ جیسا کہ دنیا میں کسی کے پاس جرگہ لے جائیں کسی قاتل مجرم کے حق میں سفارش کے لئے تو وہ یہی کہے گا کہ مولوی صاحب ذرا تو سوچ لیتے کہ یہ معاملہ کیسا ہے۔ آپ کیسے جرگہ میں آئے ایسے ظالموں کے حق میں تو عقلمند کیلئے اتنا جملہ بھی کافی ہوتا ہے۔ تو قیامت کے دن ان اقوام میں فرعون بھی ہو گا نمرود بھی، ہامان بھی اور شداد بھی۔ اور اس طرح اولیاء بھی ہوں گے، نیکوکار اور بزرگ بھی اور اللہ کے مقرب بھی، تو اللہ کا ہر نبی یہ خیال کرے گا کہ اللہ ہمیں یہ نہ کہہ دے کہ بھلا ایسے لوگوں کے سفارش کرنے آئے ہو، اللہ کا اتنا اور شکوہ بھی بڑی چیز ہے۔ جو ہر نبی کے لئے خوف کا باعث ہو گا۔ ہر نبی کہے گا۔ کہ میں معذور ہوں۔ ان ربی غضب الیوم غضباً۔ میرا رب آج نہایت غضب میں ہے، ایک کے بعد دوسرے نبی کے پاس تمام انبیاء کے پاس لوگ چلے جائیں گے سب معذرت ظاہر کر دیں گے۔ کہ ہمیں

رحمۃً للعالمین شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ تو ایک بہت بڑی رحمت ہے امت کے لئے ، امت کی دو قسمیں ہیں، ایک امت دعوت ہوتی ہے۔ ایک امت اجابت امت اجابت وہ جس نے نبی کی دعوت قبول کی۔ دعوت اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہ۔ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ تو ہم نے قبول کر لیا۔ تو اسے امت اجابت کہتے ہیں۔ اور امت دعوت وہ ہے جسکی پیغمبر نے رہنمائی فرمائی دلالۃ علی الخیر کیا ہدایت اور نصیحت اور وعظ اسے توجہ ہوئی اسے دعوت کہتے ہیں، کوئی مانے یا نہ مانے مگر آپ انہیں مخاطب کرتے ہیں۔ وہ ساری امت دعوت ہے۔

اور بھائیو! پیغمبرؐ ہم سب کے روحانی والد ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وازواجہ امھاتھم۔ حضورؐ کی بیویاں حضرت عائشہ حضرت خدیجہ ام المومنین حضرت زینب ام المومنین یہ ہم سب کی مائیں ہیں۔ عبداللہ بن مسعود کی قرأت میں ہے وھو اب لھم۔ اور نبی کریم امت کے والد ہیں تو میرے محترم بھائیو! پیغمبر کا سینہ محبت سے بھرا ہوتا ہے۔ وہ کسی مسلمان کو دوزخ میں جانے نہیں دیتا۔ مگر کافر کو بھی نہیں لے جانا چاہتا۔ کافر کے بارہ میں بھی ہمارے نبی نہیں چاہتے کہ دوزخ میں چلا جائے۔ ایک دو واقع آپ کو معلوم ہیں ایک اس وقت کا ہے جب کہ نبی کریم کا جسد مبارک احد میں زخمی ہو گیا۔ دانت مبارک شہید ہو گئے، رخسار مبارک پہ زخم آئے۔ اور پیغمبر سے قربان جائیں کہ ہاتھ میں رومال ہے جہاں سے خون نکلتا ہے، جلدی سے اسے رومال میں جذب فرماتے ہیں، پیشانی کا خون رخساروں کا خون۔ اس لئے کہ یہ خون کہیں زمین پہ گر کر امت کیلئے عذاب کا باعث نہ بن جائے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ ان لوگوں کے ہاتھوں ہمارے ستر صحابہؓ شہید ہو گئے۔ ستر زخمی ہو گئے۔ کوئی بھی تندرست نہ رہا۔ آپ زخمی ہو گئے۔ آپ ان کے بارہ میں بددعا فرمائیں، اور نبی کی بڑی طاقت ہوتی ہے بظاہر وہ بغیر دولت کے ہوتا ہے، بغیر فوج و پولیس کے ہوتا ہے۔ مگر درحقیقت اس کے پاس اتنی طاقت ہوتی ہے کہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بھی مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ ہمارے اور آپ کے جد امجد حضرت نوح نے دعا کی: رب لاتذر علی الارض من الکافرین دیارا۔ یہ ایک لفظ ہے، ایک بول ہے، تو نہ بم پھینکا نہ ہائیڈروجن بم، نہ توپ چلائی، مگر طوفان آیا اور ایسا طوفان کہ بڑے سے بڑے پہاڑ پر بھی ۸۰، ۸۰ گز پانی چڑھ گیا۔ تو نبی کمزور نہیں ہوتا۔ بڑی طاقت خدا نے دی ہوتی ہے۔

اور ایک بات سے دوسری بات یاد آئی —— حضور اقدس کی طاقت بتلا دوں ہر نبی کی ایک دعا امت کے بارہ میں مقبول ہوتی ہے، تو قیامت کے دن جب محشر میں ساری قومیں جمع ہوں گی جیسے ہم یہاں عیدگاہ میں جمع ہیں۔ تو ساری اقوام عرصۂ محشر میں جمع ہوں گے، ان میں انبیاء بھی ہوں گے۔

اسکی ہمت نہیں، اب آپ اپنے نبی کی طاقت دیکھیں کہ یہ اقوام مل کر حضورؐ کے پاس جائیں گے۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے دنیا میں وعدہ کیا ہے کہ لیغفرلك الله ماتقدم من ذنبك وما تاخّر۔ کہ آج صلح حدیبیہ اور اس میں آپ کے تحمل کے صلہ میں یہ سرٹیفکیٹ مل رہا ہے۔ کہ ماتقدم بھی تمام معاف اور ماتاخر بھی جس میں قیامت کا دن بھی ہے۔ تو ہر نبی کے لئے ماتقدم من ذنبک کا اعلان تو ہے۔ مگر حضورؐ اقدس کے لئے ماتاخر کا بھی اعلان ہے۔ اور تراویح میں تلاوت میں منبر و محراب پر لوگ یہ آیت پڑھتے اور سنتے آئے ہیں۔ ہر ایک کو معلوم ہے کہ اللہ آئندہ بھی حضورِ اقدس سے خفا نہیں ہوں گے۔ تو حضورؐ کے پاس جائیں گے اور آپؐ ایک طویل عرصہ کے لئے جو اللہ کے علم میں ہے۔ اللہ کی بارگاہ میں سربسجود ہو جائیں گے۔ اور جو حمد و ثناء اللہ القاء کریں گے اس سے اللہ سے مناجات کریں گے اور دعا کریں گے کہ یا اللہ اب حساب کتاب شروع فرمادے۔

—— تو آپ اکیلے اپنی امت کیلئے رحمت نہیں۔ ساری امتوں کے لئے رحمت ہیں۔ طائف کے پہاڑوں میں احد کے میدان میں زخمی زخمی ہیں، حضورؐ بد دعا کر دیں، آپ دعا کرتے ہیں۔ اللھم اھد قومی فانھم لایعلمون ۔ ہم ایسے نبی کے امتی ہیں۔ اللہ ان کی راہ پر ہمیں چلادے۔

کارلائل ایک انگریز کہتا ہے کہ میں حیران ہوں ایک طرف پتھر برستے ہیں۔ مگر دوسری طرف سے جواب میں پھول برسائے جاتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کہیں جا رہے تھے۔ انہیں گالیاں دی گئیں انہوں نے جواب میں دعائیں دیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بخشدے۔ واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما۔ آج جتنا بڑا پشتون ہوگا، کہے گا ہیچو من ڈنگرے نیست۔ میرے جیسا دوسرا جانور کوئی نہیں۔ میں خوددار ہوں، میری بھی کوئی پوزیشن ہے تم نے تو مجھے گرا دیا میری حیثیت سے بے خبر نہیں ہو۔ تم نے تو مجھے نیست و نابود کر دیا۔ تو ایسے جملے ابلیس کا سکھایا سبق ہے۔ اس نے بھی کہا تھا انا خیر منہ خلقتنی من نار و خلقتہ من طین —— آج ہم بھی ذرا سی بات کا جواب گولی سے دیتے ہیں۔ عجیب مسلمان ہیں کسی نے گالی دی اور تھپیڑ کا جواب پستول سے دیا گیا تو وہ بڑا غیرتی ہے۔ وہ بڑا پٹھان ہے۔

الغرض پشتون ہونے کی بات چلی تو اس ضمن میں یہ باتیں آگئیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حضورؐ کی امت میں محسوب فرمادے اور حضورؐ کی شفاعت سے مشرف فرمادے۔

نبی کسی کا بدخواہ نہیں ہوتا۔ ابلیس ہمارا بڑا دشمن ہے۔ حضرت موسیٰ کو سلام کیا اور پھر کہا کہ آپ تو اللہ کے بڑے مقرب ہیں۔ تیری ہر درخواست قبول ہوتی ہے تو میرے لئے بھی دعا کر لو خدا مجھے بھی بخشدے حضرت موسیٰ نے فرمایا بہت بہتر کوہ طور گئے تو کہا کہ ابلیس کی ایک درخواست بھی لایا ہوں

کہ خدا مجھے بخش دے۔ فرمایا بہت اچھا دہی پرانی بات ہے۔ اب آدم علیہ السلام کو سجدہ کر دیں، یعنی رخ اس کی طرف کرے سجدہ اللہ تعالیٰ کیلئے تھا تعمیل حکم کرانا تھا۔

——— تو ہائے اکوڑہ خٹک کے پشتون۔ ابلیس کتنے بڑے پٹھان بنے یہ بات سنی تو کہا کہ یہ مونچھ مجھ سے نیچے نہیں ہو سکتے، جنت نہیں درکار، انانیت نہیں چھوڑ سکتا، اس کو تیار نہیں ہوں۔ تو آج ہم سمجھتے ہیں کہ پٹھانیت عبارت ہے تکبر سے اور اسے نام دیتے ہیں خودداری کا۔ ہاں یہ خودداری اچھی ہے۔ کہ بھوکے بھی ہو تو کسی سے سوال مت کرو۔ مگر یہ کہ میں بنگلہ اور جائداد کا مالک ہوں میرے پاس علم ہے میرے پیچھے قوم ہے، پولیس ہے فوج ہے تو یہ خودداری اور تکبر شیطان کی شان ہے۔ شیطان بڑا عالم تھا قارون بڑا دولت مند تھا۔ فرعون بڑا بادشاہ تھا۔ کہاں گئے یہ سب لوگ۔ ؟ کدھر گئے۔ ؟

تو آج ہماری ہر ادا مرض، ہمارا ہر خیال باطل، رات سو کر سوچتے ہیں کہ دوسرے بھائی کہ کیسے کنواں کھود دیں گے، فلاں نے وہ زمین خریدلی یہ کام وہ کام کیا میں کیسے اُسے نیچا دکھا سکوں گا۔

الغرض کس کس بات کا رونا رویا جائے۔ ہر بال شکوہ کرتا ہے۔ ہر جزو روتا ہے۔ (ایک پرچی میں جوا کی بات کی گئی تھی کہ عید کے دن لوگ جُوا کھیلتے ہیں۔)

بھائیو! پاکستان اور جُوا۔ ؟ پاکستان اور کھیل تماشے۔ ؟ پاکستان اور رقص و سرود ؟ ذرا گریبان میں منہ ڈال کر ایمان سے کہہ دو کہ قیام پاکستان کے وقت ۱۹۴۷ء میں قوم کا نعرہ یہ تھا یا نہیں کہ پاکستان کا مطلب لا الہ الا اللہ ہے۔ اور یہ کہ ہم ایک اسلامی مملکت قائم کریں گے۔ شریعت کا نفاذ کریں گے۔ قال اللہ اور قال الرسول کا چرچا ہوگا۔ اور دنیا کو بتلائیں گے کہ حضورؐ اقدس کے قدموں کے گرد و غبار کا بھی کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

مگر آج تو عبادت کا دن ہے۔ جتنے مجرم اللہ تعالیٰ رمضان میں بخشتا ہے اتنے ہی عید کی رات بخشتا ہے۔ اور جب نماز عید سے فارغ ہو کر جاؤ گے تو اعلان ہوگا کہ جتنے بھی برے تھے آج دعاؤں اور توبہ کے بدلے معاف کر دئے گئے۔ مگر آج اس پاک دن میں تم ایمان سے کہہ دو کہ انگریز کا زمانہ ہندو کا زمانہ آپ نے اور ہم نے دیکھا ہے۔ اور الحمد للہ اب پاکستان بنے ۴۰ سال ہو گئے ایمان سے کہہ دو کہ عیدگاہ سے باہر ہندو اور انگریز کے دور میں جو جُوا ہوتا تھا وہ زیادہ تھا، یا اب زیادہ ہے۔

یہ ڈھول تماشے پہلے بہت تھے یا اب بہت ہیں۔ (آوازیں، اب بہت بڑھ گئی ہیں۔)

اس وقت مسلمان میں کچھ غیرت ہوتی تھی کہ انگریز سے مقابلہ ہے، ہندو سے مقابلہ ہے۔ ایسے کام کرنے میں شرم محسوس ہوتی تھی۔ مسلمان کو ہندو سے کچھ رقابت اور غیرت ہوتی تھی۔ ہم کچھ نہ کچھ دینی اقدار

کی حفاظت کرتے تھے، اب رہ گئے ہم اور آپ سارے مسلمان ہی مسلمان۔

حقوق نسواں کمیٹی کی رپورٹ | آزادی کا دور آیا، عورتوں کی آزادی، ہر چیز کی آزادی۔ اب عورتوں کے حقوق کا مسئلہ سامنے آرہا ہے۔ سال دو سال بعد پتہ چلے گا، جب عورتیں تمہارے گلے میں رسیاں ڈال کر جب چاہیں گی طلاق دیں گی ۔۔۔ یہ عورتوں کے حقوق ہیں۔ یہ فلاں کے حقوق ہیں۔ یہ فلاں قوم کے حقوق ہیں۔ حقوق کا یہ دور ایسا چلا ہے۔ کہ اس میں اسلام بیچارے کے سارے حقوق تلف کر دیئے گئے ۔۔۔ اتنا عرض کردوں کہ اسلام کسی سے جبراً بلا معاوضہ کوئی چیز غصب کرنے کا روادار نہیں کسی سے زیادتی کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

جمہوریت کی لعنت | مگر آج کل ہم جمہوریت کی لعنت میں ہیں یہ لعنت کیسے ہے۔؟ اسلام کہتا ہے کہ دو فریق ہیں ایک کے دلائل مضبوط اور صحیح ہیں دوسرے کے صحیح نہیں تو قوی دلائل کے مطابق فیصلہ کرنا ہے رات ہمیں اطمینان ہوا دلائل اور گواہوں سے (صوبہ سرحد کے اکثر علاقوں میں جمعہ کی شام کو رویت ہوئی اور ہفتہ کے دن عید الفطر ہونے کا اعلان کیا گیا) تو حکم عید کا ہوا۔ مگر آج وہ دور ہے جمہوریت کا کہ دو ہزار دلائل ہوں قرآن کیوں پیش نہ کریں حدیث کیوں نہ ہو۔ فقہ کیوں نہ ہو مگر کہیں گے کہ مولوی صاحب نمائندے تو ادھر کے ہیں۔ آپ تو ۵، ۶ ہیں۔ اکثریت کا ووٹ ادھر ہے۔ ۵، ۶ کیا کریں۔ تو ہمارے قوانین کا جو مبنیٰ اور مدار ہے وہ یہ جمہوریت ہے اس نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ۲۵ سال تو قانون اور آئین نہ بنا۔ اور اب جو بنا ۱۹۷۳ء میں تو جس طرح ہم روز روز ترمیم کرکے اس کی مٹی پلید کر رہے ہیں۔ اس کی نظیر نہیں ۔۔۔ ورنہ مسلمان اور زنا۔؟ مسلمان اور جوا۔؟ مسلمان اور چوری۔؟ مسلمان اور استحصال اور غریبوں کی تحقیر۔؟ ۔۔۔

لیکن آج ہم جمہوریت کے دور میں ہیں دس آدمی ایک طرف دلائل ان کے ساتھ دو دن بحث مباحثہ میں بے کار ضائع کر دو پھر ادھر دس آدمی ہیں ادھر ایک سو دس فیصلہ ادھر والوں کا ایسے میں بحث مباحثے اور دلائل پر وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔؟

عورتوں کے حقوق بھی وہی صحیح حقوق ہیں جو خدا اور رسول نے دیئے اور مردوں کو بھی دیئے، یتیموں کو بھی دیئے، فقیروں کو بھی دیئے اور محتاجوں کو بھی دیئے، خدا اور رسول نے تو چیونٹی کو بھی حقوق دیئے کہ راستہ چلتے چیونٹیوں کو قدموں میں نہ روندا جائے، اونٹنی کا بھی حق ہے۔ اسلام میں تو سارے حقوق جمع ہیں بات ان حقوق کو پورا کرنے اور اسلام پر عمل کرنے کی ہے۔ ہم کبھی اسمبلی میں کہا کرتے ہیں کہ ہمارا آئین اسلامی ہمارا مذہب اسلامی ہے۔ تو یہ بنکوں کا سسٹم سود پہ کب تک چلے گا۔ یہ فحاشی کب

تک رہے گی۔ مگر ہم تو ۳۰ سال تک من حیث القوم وعدہ خلافی کر رہے ہیں۔ اور حدیث میں ہے کہ جو قوم وعدہ خلافی کرتی ہے۔ خدا اس پر مصیبت لے آتا ہے۔ تو آج یہ روز روز کے مصائب اُسی وعدہ خلافی کا ظہور ہے۔ ساری قوم وعدہ خلافی میں مبتلا ہے۔ تو کبھی آفات سماوی ہیں کبھی ارضی کبھی مہنگائی ایک مصیبت اور ایک تکلیف تو نہیں اس کا علاج یہ ہے کہ توبوا الی اللہ جمیعاً ایھا المومنون۔ کہ سب کے سب اللہ کی طرف لوٹ جاؤ۔

سارے کے سارے مسلمان جمع ہو کر توبہ کرلیں۔ یہ علاج ہے۔ ۱۹۶۵ء میں ساری قوم اللہ اکبر کے نعرہ پر متفق ہو گئی تو خدا نے کامیابی دی۔ اب بظاہر سب مسلمانوں کا توبہ کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ تو شریعت نے اس مشکل کا حل پیش کر دیا ہے۔ کہ یہ لاکھوں لوگ جو جوا میں مبتلا ہیں، لہو ولعب میں مشغول ہیں، معاصی میں ڈوبے ہوئے ہیں مگر یہ دس پندرہ ہزار جو عیدگاہ میں جمع ہیں جو نماز جمعہ میں جمع ہوتے ہیں، ان میں سے ہر ایک صدق دل سے اللہ کے سامنے روئے توبہ کرے اور کہے کہ یا اللہ میری قوم مجرم ہے اور میں ان سب سے بڑا مجرم ہوں۔ مگر یا اللہ میں ان کا نمائندہ بن کر آیا ہوں اپنے لئے بھی اور اپنی قوم کے لئے بھی نادم ہو کر تائب ہوتا ہوں۔ یا اللہ یہ جو بدعملی میں، جوا میں، گناہوں میں مبتلا ہیں۔ خدایا ان کے گناہ بھی معاف کر دے اور ان کی حالت بھی بدل دے۔ اللہ تعالیٰ سے قربان جائیں عجیب رحیم وکریم ہستی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے فرمایا: فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم۔ اللہ کی رحمت سے آپ صحابہ کے لئے اتنے نرم دل ہو گئے ہیں۔ ایک موقع پر صحابہؓ نے مشورہ دیا، اس پر عمل ہوا تو کامیابی نہ ہوئی تو خدا نے فرمایا: فاعف عنھم واستغفر لھم وشاورھم فی الامر۔ خدا کتنا مہربان ہے۔ اپنے حبیبؐ سے فرماتے ہیں کہ اس امت سے خفا نہ ہونا، عفو و درگذر کرنا۔ میرے دربیں انکی بخشش کی درخواست کرتے رہنا اور آئندہ بھی ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے مشورہ ان سے کرتے رہنا۔ وشاورھم فی الامر۔ آج ہماری ایک مصیبت ایک تکلیف اور مشقت نہیں ایک مرض نہیں یہ جتنے بھی امراض باطنی ہیں اس کا علاج یہی ہے کہ تم لوگ یہاں سب کیلئے کفارہ بن جاؤ۔ صرف اپنے لئے نہیں سارے اکوڑہ کیلئے سارے علاقہ خٹک کے لئے سارے پاکستان کے لئے جتنے بھی مصیبت زدہ ہیں جتنے بھی معصیت زدہ ہیں۔ ان سب کے حق میں دعائے استغفار کرو اگر ہر شخص قوم کا نمائندہ بن کر ان کے حال پر روئے، سحری کے وقت روئے استغفار کرے، فرض نماز کے بعد روئے جمعہ کی نماز کے بعد دعا کرے، اصلاح کی دعا کرے۔ تو انشاء اللہ انشاء اللہ انشاء اللہ خدا ہم سب پر رحمت کر دے گا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

ایک تحقیقی مقالہ

از جناب مولانا عبدالشکور صاحب
صدر شعبہ اسلامیات، پشاور یونیورسٹی

جنگ کا اسلامی ضابطہ

جنگ وجدال کا سلسلہ انسان کی ابتدائے آفرینش سے شروع ہے۔ بلکہ یہ انسانی طبیعت اور فطرت کا خاصہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ انسان کے وجود میں آنے سے قبل ہی فرشتوں نے بارگاہِ ایزدی میں یہ درخواست کی تھی۔ "اتجعل فیھا من یفسد فیھا و یسفک الدماء"[1]، کیا آپ زمین میں ایسے کو پیدا کرتے ہیں۔ جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خونریزی کرے گا؟ فرشتوں کو یہ علم انسان کی ساخت و پرداخت کو دیکھ کر ہوا تھا۔ اس میں جنگ وجدال کی علامات خوب نمایاں تھیں۔

جنگ وجدال انسان کے فطری اخلاق غضب و شہوت کی پیداوار ہے۔ حقیقت میں یہی اخلاق انسانی بقا کے ضامن ہیں۔ انہی اخلاق کی بدولت انسان تنازع للبقاء کے جذبہ سے سرشار ہے۔ یہی انسان کی تعمیری صلاحیتوں کے سرچشمہ ہیں۔ اس عالم رنگ و بو کی یہ تمام رونق انہی قوتوں کی مرہونِ منت ہے، یہ تو ایک پہلو ہے، دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہی قوتیں جب بے اعتدالی کا شکار ہو جاتی ہیں تو یہ فساد کو جنم دیتی ہیں، خودغرضی کا سبب بنتی ہیں اور خودغرضی نا روا کشت و خون کا سبب بنتی ہے۔ پھر یہ قابیل کا روپ دھار لیتی ہے اور اپنے بھائی ہابیل کے گلے پر چھری پھیرتی ہے۔ اسلام کا منشاء یہ ہے کہ غضب و شہوت کی قوتوں کو اعتدال پر رکھ کر تعمیر کے لئے کام میں لائی جائیں۔

اسلام کی آمد کے وقت جنگوں کی جو شکلیں قائم تھیں اور ان کے جو اسباب و محرکات تھے۔ ان کے پیشِ نظر جنگ صرف اور صرف تباہی و بربادی اور نسلِ انسانی کے استیصال کا پیش خیمہ تھی۔ چنانچہ اس وقت انسانی آبادی دو حصوں پر منقسم تھی۔ کہیں قبائلی زندگی تھی۔ جہاں کوئی باقاعدہ حکومت نہیں تھی۔ ہر قبیلہ کا اپنا نظام تھا۔ ایسے لوگوں کی جنگیں افراد کے سبب چھڑ جاتی تھیں اور پھر ان میں قبائل ملوث ہو جاتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کسی قبیلہ کا سردار اپنے غرور و نخوت، بڑائی، رعب و دبدبہ اور شان و شوکت کے اظہار کے لئے معمولی معمولی باتوں پر الجھ جاتا تھا اور میدانِ کارزار گرم کرتا تھا، جس میں اس کا قبیلہ اور حلیف قبائل شریک ہو جاتے۔ پھر وہ جنگ سالہا سال تک قائم رہتی۔ اور انتقام در انتقام کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ جہاں جہاں قبائلی نظام تھا وہاں جنگ کا یہی حال تھا۔

عرب جو اسلام کا مطلع ہے وہاں کی زندگی بھی قبائلی تھی۔ عربوں کی حالت یہ تھی کہ جنگ ان کی طبیعتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ اور جنگجو ہونا ان کا سرمایۂ افتخار تھا۔ جیسے ایک عرب شاعر کہتا ہے ؎[2]

وانی لا ازال اخا حروب اذا لم اجن کنت مجن جان

"یعنی میں تو جنگجو ہوں۔ ہمیشہ لڑائیوں میں گھرا رہتا ہوں۔ اگر کبھی خود ظلم نہیں کرتا تو ظالموں کا سپر بن جاتا ہوں۔"

---

[1] سورہ بقرہ پ ۱ [2] باب الحماسی

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ان قبائلی جنگوں کے اسباب نہایت معمولی ہوتے تھے یا لوٹ مار، سلب و نہب کی غرض سے ہوتی تھیں یا پھر اپنے سرِ غرور کو اونچا رکھنے کے لئے۔ مثلاً حرب[۱] داحس وغبراء نے صرف ایک گھوڑے کے بھڑکانے پر تمام عرب میں آگ لگا دی۔ عرب کے دو قبیلے عبس اور ذبیان تھے۔ ایک کا سردار قیس ابن زہیر اور دوسرے کا حمل بن بدر تھا۔ داحس قیس کا گھوڑا تھا اور غبراء حمل کی گھوڑی تھی۔ دونوں کے درمیان دوڑ کا مقابلہ سو[۱] اونٹوں کی شرط پر باندھا گیا۔ حمل نے چند آدمیوں کو مقرر کیا تھا کہ اگر قیس کا گھوڑا داحس گول پر پہلے پہنچتا ہے تو اس کا منہ گول سے پھیر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس پر ان قبائل کے درمیان چالیس[۱] برس تک جنگ ہوتی رہی۔ اس جنگ میں بہت سے لوگ مارے گئے۔ حمل کا بھائی حذیفہ بن بدر بھی مارا گیا۔ اس کے ساتھ جو سلوک کیا گیا تہذیب اس کے بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتی[۲]۔

حرب بسوس بکر بن وائل اور تغلب بن وائل کے درمیان سو[۱] سال تک جنگ جاری رہی۔ قبیلہ بکر کا سردار کلیب تھا وہ بڑا مغرور تھا۔ اس نے یہ پابندی عائد کی تھی کہ جب اس کے مویشی پانی پینے کے لئے گھاٹ پر پہنچیں تو کسی اور کے مویشی ان کے ساتھ ملنے نہ پائیں۔ چنانچہ بسوس نامی ایک عورت کی اونٹنی "سراب" ایک دن کلیب کے مویشیوں کے ساتھ گھاٹ پر پہنچی۔ کلیب نے دیکھا تو تیر نکال کر اس کے تھن کو نشانہ بنایا، اس کے تھن کو چھیڑ ڈالا۔ اونٹنی زخمی حالت میں گھر پہنچی۔ بسوس نے اپنی اونٹنی کی یہ حالت دیکھی تو چادر پھاڑتے ہوئے چلا اٹھی کہ یہ کتنا ذلت آمیز سلوک ہے۔ ہائے حق پناہ ادا کیا جائے۔ وہ تغلب بن وائل کے سردار جساس کے گھر میں اور اس کی پناہ میں رہتی تھی۔ جساس کلیب کا سالہ تھا۔ اس نے فوراً ہتھیار باندھے اور کلیب پر حملہ آور ہوا۔ اس کو قتل کیا۔ اس بات پر ان قبائل میں سو[۱] برس تک جنگ ہوتی رہی[۳]۔

اس وقت کی متمدن حکومتیں ایران اور روم تھیں۔ مدائن سے قسطنطنیہ تک کی زمین ان دو بڑی شہنشاہیوں کی جوع الارض کا لقمہ بنی ہوئی تھی۔ تہذیب پامال ہو رہی تھی، شرافت سر پیٹ رہی تھی، انسانیت خون کے آنسو بہا رہی تھی مگر شہنشاہیت کا سرِ غرور اونچا ہو رہا تھا۔ وہ ان بربادیوں کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی، آبادیاں اجڑ رہی تھیں، گھر لٹ رہے تھے۔ کھیتیاں پامال ہو رہی تھیں۔ مگر انسانوں کی کھوپڑیوں پر قصرِ قیصری و ایوانِ کسریٰ کی شاندار بنیادیں اٹھائی جا رہی تھیں۔

ارضِ فلسطین مذہبی انانیت کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ یہود کہتے تھے نحن ابناء اللہ و احباءہ "ولیست النصاریٰ علیٰ شیئٍ" اور عیسائی کہتے تھے "ولیست الیہود علیٰ شیئٍ"۔ اس مذہبی منافرت کے جذبے سے سرشار ہو کر نصرانی حکومت یہودیوں کے ساتھ غلاموں کا سا برتاؤ کرتی تھی۔ یہودیوں کی ملی وجود سے منکر تھی۔ چنانچہ ۷۰ء میں عیسائی بادشاہ ٹیٹس نے بزورِ شمشیر یروشلم کو فتح کیا۔ اس موقعہ پر قتلِ عام میں ایک لاکھ ۳۳ ہزار یہودی مارے گئے۔ ۶۷ ہزار گرفتار کر کے غلام بنائے گئے۔ ہزارہا یہودیوں کو پکڑ پکڑ کر مصری کانوں میں کام کرنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ ہزاروں کو پکڑ کر دوسرے شہروں میں بھیجدیا گیا تاکہ ان کی تھیٹروں اور کلوسیموں میں جنگلی جانوروں سے پھڑوانے یا شمشیر زنوں کے کھیل کا تختۂ مشق بننے کے لئے استعمال کیا جائے۔ تمام دراز قد اور حسین لڑکیاں فاتحین کے لئے چن لی گئیں۔ اور یروشلم کے شہر

---

[۱] الحرب فی القرآن۔ مولانا ابو اسلام آزاد [۲] عقد الفرید جزء خامس [۳] ایضاً

اور ہیکل کو مسمار کر کے پیوندِ خاک کر دیا گیا[1]

یہودیوں نے شہر صور کا محاصرہ کر کے ہزاروں عیسائیوں کو تہ تیغ کیا۔ یہی نہیں بلکہ جنگ روم و ایران میں ایرانیوں کے ہاتھوں قید ہونے والے اسّی ہزار قیدیوں کو خرید کر کے ان کے خون سے اپنی آتشِ انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو سرد کیا[2]

ان جنگوں کے مقاصد ظاہر ہے کہ بہت پست تھے۔ ان کے لئے ضابطہ اخلاق تو در کنار سرے سے کوئی ضابطہ ہی نہیں تھا۔ اگر کچھ تھا تو یہی کہ دشمن کو ہر طرح سے نیست و نابود کیا جائے۔ یہاں تک کہ دشمن کے شیر خوار بچوں کو بھی بیدریغ تہ تیغ کیا جاتا تھا۔ اسلام نے جنگ کو ذریعۂ رحمت بنایا، زمین کو فتنہ و فساد سے پاک کرنے، ظلم، عدوان و سرکشی کے انسداد، زیر دستوں کو زبردستوں کی چیرہ دستیوں سے نجات دلانے، عبادت گاہوں اور دیگر مقدس مقامات کی حفاظت کا وسیلہ قرار دیا۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے "ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض ولکن اللہ ذو فضل علی العلمین"[3]۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں (یعنی ظالموں) کو دوسرے لوگوں کے ذریعے دفع نہ کرتے تو زمین فساد سے بھر جاتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ عالمین پر بڑا مہربان ہے — اس کی مہربانی کا تقاضا ہے کہ جب کوئی زمین میں فساد پھیلانا شروع کرتا ہے اور اس کی مخلوق کو اذیت دینے لگتا ہے، تو اس کے توڑ کے لئے اللہ تبارک و تعالیٰ دوسرے کو کھڑا کر دیتا ہے۔ وہ طاقت کے بل بوتے پر اس کے شر کو دفع کرتا ہے۔ سورۂ حج میں ہے ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع و بیع و صلوٰت و مساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا"۔ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجے اور معبد اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے مسمار کر ڈالیں — جس آیت کے ذریعے مسلمانوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت دی گئی تھی اسی میں جنگ کا مقصد یہ بیان ہوا ہے"۔ اذن للذین یقٰتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ"[4] جن مومنوں کے خلاف ظالموں نے جنگ کر رکھی ہے اب انہیں بھی جنگ کی رخصت دی جاتی ہے۔ کیونکہ ان پر سراسر ظلم ہو رہا ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے۔ یہ وہ مظلوم ہیں جو بغیر کسی حق کے اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے ہیں۔ ان کا جرم اگر کچھ تھا تو فقط یہی کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے۔

سورۂ نساء رکوع ۱۰ کی آیت ہے" وما لکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من ھٰذہ القریۃ الظالم اھلھا واجعل لنا من لدنک ولیا واجعل لنا من لدنک نصیرا"۔ اور تمہیں کیا ہوا ہے؟ کہ تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کرنے سے گریز

---

[1] تفہیم القرآن جلد دوم　[2] محمد المثل الکامل جاد مولیٰ بک مصری　[3] سورۂ بقرہ پ۲، آخری رکوع
[4] سورۃ الحج

کرتے ہو۔ جب کہ کمزور مرد، عورتیں اور بچے کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں اس آبادی سے نکال دیجئے جہاں کے باشندے ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنی طرف سے معاون و مددگار کھڑا کر دیجئے۔" یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ اسلام کی نظر میں جنگ کا مقصد ظلم کا انسداد ہے۔

یہی نہیں بلکہ اسلام نے جنگ کو عبادت قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔ والذین امنوا یقاتلون فی سبیل اللہ[1] والذین کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغوت ج۔ مومن اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور کافر شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں"۔ اس لئے تکمیل عبادت کے سلسلے میں جتنی اخلاقی اور قانونی پابندیاں ہو سکتی ہیں۔ وہ تمام جنگ کے بارے میں عائد کی گئی ہیں۔ چونکہ اسلام کی نظر میں جنگ کا مقصد فریقِ مخالف کی اصلاح اور ہدایت ہے۔ اس لئے جگہ جگہ ارشاد ہوا ہے۔ لعلھم ینتھون۔ لعلھم یذکرون۔ شاید فریقِ مخالف فساد برپا کرنے سے رُک جائے۔ شاید وہ عبرت حاصل کرے۔

جنگ کا اسلامی تصور قتال بالمقصد ہے۔ اس لئے حصولِ مقصد کے بعد جنگ جاری رکھنا منع ہے۔ ارشاد ہے "فان انتھوا[2] فلا عدوان"۔ قرآن حکیم کا حکم ہے کہ اگر جنگ کے دوران دشمن سے ایسی علامت ظاہر ہو جائے جو اس کے جنگ سے کنارہ کش ہونے کی دلیل ہو۔ تو پھر اس پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے بلکہ اسے پناہ دی جائے۔ ارشاد باری تعالےٰ ہے "ولا[3] تقولوا لمن القی الیکم السلام لست مومنا ج" اور جو تمہیں سلام کرے جو اس وقت مسلمانی کا شعار (PASS WORD) تھا۔ تو تم اسے نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں۔ بلکہ اسے مسلمان سمجھو اور اسے قتل نہ کرو، نہ اس کے مال کو چھین لیا کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابی نے پوچھا کہ اگر میدانِ جنگ میں میرا سامنا ایک کافر کے ساتھ ہو جائے اور ہم ایک دوسرے پر تلواریں چلانے لگیں۔ اس دوران وہ میرا ایک ہاتھ کاٹ ڈالے۔ پھر مجھ سے ایک درخت کی اوٹ میں پناہ لے اور کلمہ پڑھے۔ تو کیا اس کے بعد میں اسے قتل کر سکتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا نہیں۔ صحابی نے عرض کی یارسول اللہ! اس نے جو میرا ہاتھ کاٹ لیا ہو گا۔ آپؐ نے فرمایا کہ کلمہ پڑھنے کے بعد تم اسے قتل نہیں کر سکتے۔ اگرچہ اس نے تمہارا ہاتھ کاٹ لیا ہو۔ اور اگر اس کے بعد قتل کرو گے تو تم اس مرتبہ میں پہنچ جاؤ گے جو اس کلمہ پڑھنے سے پہلے اس کا تھا۔ اور وہ اس درجہ میں پہنچ جائے گا جو اسے قتل کرنے سے قبل تمہارا تھا[4]۔ ایک غزوہ میں حضرت خالد نے ایسے ہی شخص کو قتل کیا تھا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو حضرت خالدؓ سے سختی سے جواب طلبی کی۔ اور اپنی ناراضگی کا اظہار فرماتے ہوئے اللہ تعالےٰ کے حضور میں گڑگڑا کر دعا کی کہ یا اللہ! یہ خالدؓ کا عمل ہے، تیرا رسولؐ اس سے بری ہے[5]۔

چونکہ اسلام میں جنگ کو مقصدیت حاصل ہے۔ اس لئے اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مقصد کو کم از کم خونریزی

---

[1] سورۂ نساء۔ [2] سورۂ بقرہ۔ [3] سورۂ نساء۔ [4] بخاری شریف کتاب المغازی
[5] بخاری شریف، کتاب المغازی۔

کر کے حاصل کیا جائے۔ چنانچہ عہدِ نبوی کی حروب پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت بخوبی عیاں ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں چھوٹی بڑی کل اسی جنگیں ہوئیں۔ جن میں مقتولین کی کل تعداد ۱۰۱۸ ہے۔ ان میں مسلمان مقتولین کی تعداد ۲۵۹ اور کفار مقتولین کی تعداد ۷۵۹ ہے۔[1]

اس کے برعکس پہلی جنگِ عظیم ۱۸-۱۹۱۴ء میں مقتولین کی تعداد ۷۴ لاکھ ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں بقول علامہ افغانی مقتولین کی تعداد چھ کروڑ۔ ناکارہ ہونے والے افراد کی تعداد تقریباً ڈھائی کروڑ۔ اور دولت اتنی ضائع ہوئی کہ اگر تمام دنیا کے لوگوں پر ۲۰۰ روپیہ ماہوار فی خاندان کے حساب سے خرچ کی جاتی تو سو سال کے لئے کافی تھی۔[2] یہ تو عالمی جنگ تھی۔ ویت نام کی جنگ ابھی ابھی ختم ہوئی ہے۔ اس میں امریکہ کا نقصان ۔ ۵۶ ہزار فوجی ہلاک، ۱½ لاکھ امریکی اپاہج، ایک کھرب امریکی ڈالر خرچ ہوئے۔ گولہ بارود اتنا خرچ ہوا کہ اس کی مقدار دوسری جنگ عظیم میں خرچ شدہ گولہ بارود سے زیادہ ہے۔ ۲½ لاکھ جنوبی ویت نامی ہلاک ہو گئے۔[3]

چونکہ جنگ کو اسلام میں عبادت کا درجہ حاصل ہے اس لئے جنگ میں شریک افراد پر نیتِ صالح، خلوصِ قلب، رضائے حق کی طلب، تقویٰ، طہارت، خوفِ خدا، امانت و صداقت، عصمت و عفت اور ایفائے عہد کی پابندی لازم ہے۔ قرآن کریم نے مجاہدین کو مختلف پیرایوں میں ان اوصاف سے متصف ہونے کا حکم فرمایا ہے۔ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان اوصاف پر کاربند رہنے کی تلقین فرمائی ہے۔ یہی سبب ہے کہ صحابہ کرامؓ ان اوصافِ جمیلہ کے پیکر تھے۔ چنانچہ جب رومی حکومت کا ایک جاسوس مسلمان فوج کی حالت معلوم کرنے کے لئے آیا، کچھ وقت رہنے اور حالات معلوم کرنے کے بعد جب واپس چلا گیا تو اس نے اپنی رپورٹ پیش کی جس میں مسلمان فوجیوں کے اوصافِ جمیلہ اور اخلاقِ حسنہ کی تفصیل تھی۔ اور آخر میں اپنی طویل رپورٹ کا خلاصہ ان لفظوں میں ذکر کیا "انھم باللیل رھبان و بالنھار فرسان" یعنے وہ رات کو زاہد شب زندہ دار ہیں اور دن کو بہادر شہسوار ہیں۔

ہر حال میں عدل و انصاف پر قائم اور ہر معاملے میں احسان کے تقاضے کو پورا کرنا اسلام کا ناطق حکم ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔ ان اللہ یأمرکم بالعدل والاحسان۔ دونوں کو مطلق چھوڑ کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ عدل وانصاف کا برتاؤ ہر ایک کے ساتھ لازم ہے۔ اس میں خویش و اقارب، اجنبی اور دوست و دشمن کا امتیاز کرنا جرم ہے۔ قرآن کریم کا یہ بھی ارشاد ہے "ولا یجرمنکم شنان قوم علی ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ" اس عدل وانصاف کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں پر یہ پابندی عائد ہے کہ وہ صرف اس کو تہ تیغ کریں جو عملاً لڑائی میں حصہ لے رہا ہو۔ اور اسے بھی قتل اس طرح سے کریں کہ احترامِ آدمیت مجروح نہ ہونے پائے یعنی اس کو مثلہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ نہ اس کی اجازت ہے کہ دشمن کے بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور جنگ سے کنارہ کش لوگوں کو گزند پہنچایا جائے۔ غنیم کے

---

[1] رحمۃ للعالمین جلد سوم [2] بحوالہ تقریر علامہ شمس الافغانی ۱۷ مارچ ۱۹۷۶ء بمقام روس کیمپل ہال اسلامیہ کالج پشاور
[3] اداریہ۔ روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی ۳ مئی ۱۹۷۵ء۔

اموال کو بھی ناجائز طریقے سے نقصان پہنچانا ممنوع ہے۔ مثلاً کھیتوں، باغات اور فصلوں کو تباہ کرنے کی اجازت ہے نہ مویشیوں کو ہلاک کرنے کی اجازت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جب بھی لشکر کسی مہم پر روانہ کیا جاتا تو اسے امر کیا جاتا کہ ولا تمثلوا ولا تقتلوا کبیراً ولا طفلا ولا امرءۃً[۱]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قبیلہ عرنیہ کے چند آدمی مدینہ طیبہ آئے۔ اسلام لائے، کچھ دن رہ کر بیمار ہوئے مدینہ کی آب و ہوا انہیں راست نہ آئی۔ حضور علیہ السلام نے انہیں ہدایت کی کہ وہ مدینہ سے باہر جہاں صدقات کے مویشی ہیں چلے جائیں، ان مویشیوں کا دودھ وغیرہ پیا کریں۔ چنانچہ وہ وہاں گئے۔ چند دنوں میں بیماری سے اچھے ہو گئے۔ تندرست ہو کر مستی میں آکر مرتد ہو گئے۔ مسلمان چرواہے کو طرح طرح کی اذیتیں دے دے کر شہید کر دیا اس کی آنکھوں میں کانٹے چبھو دیئے۔ اس کی ناک اور کان کاٹ دیئے اور صدقات کے مویشی ہنکا کر بھاگ نکلے۔ مسلمانوں کو اطلاع ہوئی تو ان کے تعاقب میں دوڑے، کچھ فاصلے پر ان کو گھیر لیا۔ اس وقت کے قانونِ قصاص کے مطابق ان کی آنکھوں میں گرم سلائی پھیر دی گئی انہیں قتل کر دیا گیا اور مثلہ بنایا گیا۔ اس واقعہ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتنا اثر ہوا کہ بعد میں اس واقعہ کو یاد کر کے اظہارِ ندامت فرماتے۔ اللہ سے توبہ استغفار کرتے۔ خیرات کرتے اور مسلمانوں کو بھی توبہ و استغفار اور کثرت سے صدقات دینے کا امر فرماتے[۲]۔

حضرت ابوبکرؓ نے خلافت سنبھالنے کے بعد جیشِ اسامہؓ کو روانہ کیا۔ آپؓ نے اسے یہ تلقین فرمائی[۳] "لا تخونوا ولا تغدروا ولا تغلوا ولا تمثلوا ولا تقتلوا طفلاً ولا شیخا کبیرا ولا تفرقوا نخلاً ولا تحرقوہ، ولا تقطعوا شجرۃً مثمرۃ ولا تذبحوا شاۃً ولا بقرۃ ولا بعیرا الا للاکل واذا مررتم بقوم فرغوا انفسھم لہ" نہ خیانت کرو۔ نہ عہد شکنی کرو۔ نہ مالِ غنیمت میں نقصان کرو۔ نہ مثلہ بناؤ۔ بچوں اور بڑے بوڑھوں کو قتل نہ کرو۔ کھجوروں کے باغات کے درختوں کو نہ اکھیڑو اور نہ انہیں جلاؤ۔ اور نہ پھل دار درختوں کو کاٹو۔ بکری، گائے اور اونٹوں کو ذبح نہ کیا کرو البتہ اگر کھانا مقصود ہو۔ اور جب تم ایسے لوگوں کے پاس سے گزرو جنہوں نے عبادت گاہوں میں عبادت کے لئے کنارہ کشی اختیار کی ہو تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔

حضرت عمرؓ نے رومن حکومت کے ساتھ برسرِ پیکار مسلمان عساکر کے سپہ سالار کو جو احکام دیئے تھے ان میں مذکورہ احکام کے ساتھ سرِ فہرست خوفِ خدا کی تلقین تھی۔ یہ حکم بھی دیا گیا تھا کہ فوجی چھاؤنی کو آبادی سے دور رکھو اور جس کے تقویٰ پر تمہارا پورا اطمینان نہ ہو اسے آبادی میں جانے کی ہرگز اجازت نہ دو[۴]۔

اسلامی آدابِ جنگ میں یہ بات ضروری قرار دی گئی ہے کہ دورانِ جنگ بھی وعدے کا پاس و لحاظ رکھا جائے۔ چنانچہ حکم یہ ہے کہ اگر برسرِ پیکار دشمن سے کوئی بات طے ہو جائے تو اس کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔ اس لئے کہ یہ غدر ہے

---

[۱] طبقات ابن سعد [۲] بخاری شریف کتاب المغازی [۳] اتمام الوفاء فی سیرت الخلفاء
[۴] اتمام الوفاء

اور غدر اسلام کی نظر میں بہت بڑا جرم ہے[1]۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غدر کو شکست کا سبب قرار دیا ہے کیونکہ اس سے خواہ ظاہری کامیابی حاصل بھی ہو جائے لیکن اس سے اخلاقی شکست ہوتی ہے۔ اور اخلاقی شکست اسلامی نقطۂ نظر سے مادی شکست کے مقابلہ میں زیادہ ہلاکت انگیز ہے۔ فارس میں جو اسلامی عساکر کفار کے ساتھ مصروفِ جنگ تھے۔ انہیں حضرت عمرؓ نے لکھا تھا کہ "مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ تم علجیوں (عجمی کفار) کو کہتے ہو "مترس" یعنی ڈرومت۔ اس پر جب وہ تمہارے پاس آتے ہیں تو تم انہیں قتل کرتے ہو۔ حالانکہ اسلامی قانون کی رو سے یہ امان کے الفاظ ہیں۔ خبردار! اگر آئندہ کسی سے ایسی حرکت صادر ہوئی تو وہ سخت سزا کا مستوجب ہوگا[2]۔

جب کسی مقام میں فتنہ و فساد اور ظلم و عدوان کا دور دورہ ہو۔ انسانی زندگی تباہی و بربادی کے کنارے پہنچ چکی ہو تو اسلامی تعلیم یہ ہے کہ مسلمان لشکر وہاں جا کر حالات درست کرے خواہ طاقت کا استعمال کیوں نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ خلفاء راشدین کے زمانے تک اسلامی لشکر جس علاقے میں پہنچتا تو اپنی آمد کا مقصد یہی پیش کرتا تھا "جئنکم[3] لنخرجکم من جور الادیان الی عدل الاسلام" یعنی جب ان سے ان کی آمد کا مقصد پوچھا جاتا تو وہ بتاتے کہ ہم اس لئے آئے ہیں کہ تمہیں باطل نظاموں کے ظلم سے نجات دلا دیں اور تم میں اسلامی عدل و انصاف کا چرچا کریں۔ یہ صرف دعویٰ ہی نہیں تھا بلکہ مسلمان اپنے طرزِ عمل سے اس کا ثبوت بھی فراہم کرتے تھے۔ چنانچہ شام کا ایک شہر حمص فتح ہوا تو وہاں کے لوگوں سے ان کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کے انتظام پر اٹھنے والے خرچہ کے لئے جزیہ کے نام سے کچھ رقم وصول کی گئی۔ پھر جنگی ضرورت کی بناء پر شہر حمص سے نکلنا ضروری ہوا۔ تو اسلامی افواج کے سپہ سالار حضرت ابو عبیدہؓ نے حمص کے فوجی گورنر کو حکم دیا کہ حمص والوں سے جزیہ کی رقم جس کام کے عوض وصول کی گئی تھی چونکہ اب ہم اس کام کے کرنے سے قاصر ہو رہے ہیں اس لئے جزیہ کی رقم واپس کی جائے۔ گورنر نے حمص کے سرکردہ لوگوں کو بلایا انہیں صورتِ حال سے آگاہ کر دیا اور جزیہ کی رقم ان کے سامنے رکھ دی۔ تو انہوں نے مسلمانوں کے واپس جانے پر نہایت افسوس کا اظہار کیا۔ اور یہ کہہ کر جزیہ کی رقم کو واپس لینے سے انکار کیا۔ "واللہ نحن لفضلکم علی الروم وان الجزیۃ لکم علی رقابنا"[4] خدا کی قسم ہم تمہیں رومیوں پر ترجیح دیتے ہیں اور ہم تمہیں جزیہ ہمیشہ ادا کرتے رہیں گے"۔ باوجودیکہ رومی اور حمص والے ہم مذہب تھے لیکن مسلمانوں کا سلوک ان کے ساتھ اس قدر عادلانہ اور مشفقانہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے ماتحت رہنے میں خوشی اور مسرت محسوس کرتے تھے۔ انہیں جسمانی اور ذہنی طور پر بڑا سکون میسر آیا تھا۔ ان کی جان و مال اور آبرو محفوظ ہوگئی تھی۔

ایرانی شہنشاہیت کے ساتھ آخری بڑا معرکہ جنگِ قادسیہ ہے۔ اس کے لئے جب ایران کا نامی گرامی سپہ سالار رستم آرہا تھا۔ تو مقام کوثی میں ایک عرب مسلمان کے ساتھ ملاقی ہوا۔ رستم نے اسے کہا تم یہاں کس لئے آئے ہو؟ اس نے کہا اللہ تعالے کا ہمارے ساتھ وعدہ ہے کہ وہ ہمیں اس سرزمین کا مالک بنائے گا۔ رستم نے کہا اگر اس میں کامیاب ہونے سے

---

[1] ابن کثیر، سورۂ توبہ۔ مشکوٰۃ کتاب الجہاد [2] اتمام الوفاء [3] اتمام الوفاء
[4] اتمام الوفاء۔ فتح الحمص۔ تاریخ اسلام اکبر شاہ خان نجیب آبادی

قبل تم ختم ہو گئے۔ عربی نے کہا کوئی پرواہ نہیں۔ من قتل منا دخل الجنۃ و من بقی انجزہ اللہ وعدہ فنحن علی یقین، قال رستم قد وضعنا اذا فی ایدیکم۔ قال العربی اعمالکم وضعتکم فاسلمکم اللہ بہا[1]۔ یعنی ہم میں سے جو قتل ہو گا وہ جنت میں داخل ہو گا اور جو باقی بچے گا اللہ اس کے ساتھ اپنا وعدہ پورا کرے گا ہمیں اس پر کامل یقین ہے۔ تو رستم نے کہا اب تو تمہاری ماتحتی ہمارے لئے بڑی ذلت و رسوائی کا سبب ہوگی۔ عربی نے کہا۔ درحقیقت تمہارے اعمال نے تمہیں ذلیل کر دیا ہے اور اپنے اعمال کے سبب تم اللہ تعالےٰ کے فضل و رحم سے محروم ہو گئے ہو اور تم اپنے اردگرد جو سپید جاہ وحشم دیکھتے ہو اس سے دھوکہ نہ کھانا۔ اس لئے کہ تمہارا مقابلہ انسانوں کے ساتھ نہیں تقدیر کے ساتھ ہے۔ ان باتوں سے رستم غضب ناک ہو گیا اور اس عرب مسلمان کو قتل کر دیا۔ جب رستم کا لشکر آگے بڑھا اور مقام برس پہنچا تو وہاں کے لوگوں کے بچوں اور مالوں کو چھین لیا۔ شراب پی لی اور وہاں کی عورتوں کے ساتھ زبردستی بدکاریاں کیں۔ چنانچہ برس والوں نے رستم سے شکایت کی۔ اور کہا کہ ہم تو سلطنتِ ایران کی رعایا ہیں۔ اپنی فوج کا اپنے لوگوں کے ساتھ یہ سلوک؟ اس سے قبل تو مسلمانوں نے یہاں بزور قبضہ کیا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ رہے۔ ان کا سلوک ہمارے ساتھ نہایت اچھا تھا۔ ان کے ہاتھوں ہمارا مال، ہماری جانیں اور ہماری آبرو محفوظ تھی۔ یہ شکایت سن کر رستم نے کہا کہ بخدا اس عربی نے سچ کہا تھا کہ ہمارے اعمال نے ہمیں ذلیل اور کمزور کر دیا ہے۔ یہ تھا مسلمانوں کا طرزِ عمل دشمنوں کے ساتھ۔

اسلامی آدابِ جنگ میں سے یہ ہے کہ جب تک دشمن کو پہلے سے مطلع نہ کیا جائے جنگ شروع نہ کیا جائے۔ چنانچہ اس اسلامی حکم کے تحت مسلمانوں کا طریقہ یہ تھا کہ جب وہ کسی قوم کے ساتھ جنگ کرتے تو پہلے وہاں کے سربراہ کو ان الفاظ سے یاد کرتے تھے اختر بین ثلث اما ان تسلم فتسلم او الجزیۃ اولا فیکون بیننا و بینکم حرب[2]۔ تین باتوں میں سے ایک منتخب کر لو یا اسلام لاؤ تو سلامتی پاؤ گے یا جزیہ دینا قبول کر لو ورنہ تو پھر ہمارے اور تمہارے درمیان جنگ ہوگی۔

جب کہ تہذیب کی بلند بانگ دعوے کرنے والی مہذب اور ترقی یافتہ قوموں کا حال یہ ہے کہ جاپان نے چین کے خلاف پانچویں بار ۱۹۳۰ء میں، اٹلی نے حبشہ پر ۱۹۳۵ء، جرمنی نے پولینڈ پر ۱۹۳۹ء، ۱۹۴۱ء میں روس پر، روس نے ۱۹۴۱ء میں فن لینڈ پر کسی اعلانِ جنگ کے بغیر قبضہ کیا۔ اور ۱۹۶۵ء میں امریکہ نے بغیر اعلانِ جنگ کے ویٹنام پر بمباری شروع کی۔

۱۹۰۷ء میں دوسری ہیگ کانفرنس میں بڑی بحث و تمحیص اور ردّ و قدح کے بعد طے ہوا کہ لڑائی اس وقت تک شروع نہ کی جائے جب کہ اس سے پہلے واضح طور پر اس کی تنبیہہ کر دی جائے۔ جو ایک مدلل اعلانِ جنگ کی صورت میں ہو۔ یا ایک مشروط الٹی میٹم کی شکل میں ہو۔ اور اس اعلان کی اطلاع غیر جانبدار قوموں کو دی جائے[3]۔

اسلام نے جنگی قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا امر کیا ہے۔ اسی امر کے بجا لانے کے سبب سے صدرِ اوّل میں مسلمانوں نے

---

[1] اتمام الوفاء۔ وقعۃ القادسیہ [2] تاریخ الحضارۃ الاسلامی ـــ تاریخ الخلفاء

[3] آرٹیکل ۱ و ۲، معاہدات و ضوابط)

جنگی قیدیوں کے ساتھ جو حسنِ سلوک کیا ہے۔ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ غزوۂ بدر[۱] کے قیدیوں کا بیان ہے کہ مسلمان سپاہی خود بھوکے رہتے یا کھجوروں پر بسر اوقات کرتے اور اپنا کھانا قیدیوں کو دیتے تھے۔ ان کی شان میں قرآن نے کہا ہے ویطعمون[۲] الطعام علی حبه مسکینا ویتیما واسیرا ۰

دشمن کی فوجیں جب فاتح کی حیثیت سے مفتوحہ علاقے میں داخل ہوتی تھیں یا داخل ہو رہی ہیں تو ان کے داخلہ کا خاکہ قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔ ان[۳] الملوك اذا دخلوا قریة افسدوها وجعلوا اعزة اهلها اذلة وكذلك يفعلون ۰ ــــ

لیکن فتح کے بارے میں اسلامی آدابِ جنگ یہ ہیں کہ فتح پر ترانے خوشی کے شادیانے بجانے اور جشن منانے کی بجائے خدا کے حضور میں سجدۂ شکر بجا لایا جائے۔ مفتوحہ علاقے میں داخل ہونے کے وقت ہر ممکن کوشش کی جائے کہ کسی قسم کا خون خرابہ نہ ہو۔ بلکہ ایسا انتظام کیا جائے کہ فاتح فوج کا داخلہ مفتوح قوم کے لئے باعثِ آرام، راحت اور عزت ہو اور ہو سکے تو مجرموں کو معاف کر دیا جائے۔ مثال کی ضرورت ہو تو فتح مکہ کو سامنے رکھا جائے ــــــــ

([۱] اسلام اور اسیرانِ جنگ [۲] سورۃ الدہر [۳] سورۃ النمل)

محمد یوسف لدھیانوی
مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان

حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام

قسط ۲

"پیغامِ صلح" کے جواب میں

یأتی من بعدی کی بحث آپ نے سورۂ الصف کی آیت کریمہ و مبشراً برسول یأتی من بعدی اسمہٗ احمد نقل کرکے یہ الجھن پیش فرمائی ہے کہ :۔

"من بعدی سے دو ہی معنے اخذ کئے جا سکتے ہیں" میری وفات کے بعد" یا" میرے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد"۔ کیونکہ جب آنحضرت صلعم تشریف لائے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سطح ارضی کے کسی کونے میں موجود نہ تھے، کچھ وقت کے لئے ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ بقول یوسف صاحب آسمان پر تشریف لے گئے ہیں، لیکن مشکل یہ پیش آتی ہے کہ جب وہ دوبارہ نازل ہوں گے تو یہ آیت قرآن مجید میں ویسی کی ویسی موجود ہوگی، اور مسلمانوں کے سامنے ہوگی، اور اس کے معانی بھی وہی ہوں گے جو ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ "میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہے" یہی خوشخبری پہلے نزول کے وقت دی گئی، اور اب یہی دوسرے نزول کے وقت موجود ہے، اگر پہلے نزول والی پیشگوئی کو درست مانا جائے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات لازم آتی ہے، اور اگر دوسرے نزول کے وقت بھی اسے صحیح سمجھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت عیسیٰؑ کے پہلے نزول کے بعد احمد نام کے جس شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا وہ نعوذ باللہ۔ نعوذ باللہ اپنے دعویٰ میں صادق نہیں تھا، اب دوسرے نزول کے بعد جو آئے گا وہ سچا ہوگا۔ اور یا اس عیسیٰؑ کا دعویٰ کرنے والے کو کاذب اور مفتری کہا جائے گا، کیونکہ احمد نام کے نبی آچکے اور چلے گئے۔ اس الجھن کا حل یوسف صاحب کیا پیش کر سکتے ہیں۔" (ص ۴،۳)

میں آپ کی اس طویل عبارت کا خلاصہ دو سطروں میں نقل کر سکتا تھا، مگر میں نے آپ کی عبارت کو قصداً پورا نقل کیا ہے تاکہ آپ "قطع و برید" اور "تحریف" کا الزام اس ناتواں کے نحیف کندھوں پر نہ ڈال سکیں۔ یہی آپ کی الجھن؟ اس کا حل سب سے پہلے تو آپ کو جناب مرزا صاحب سے دریافت کرنا چاہیئے تھا کہ انہوں نے اپنی ایسی کتاب میں، جو قطب ستارہ کی طرح غیر متزلزل ہونے کی وجہ سے "قطبی" تھی، جس کے ایک ایک حرف پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر تصدیق ثبت تھی، اور جسے مصنف نے بالہام الٰہی تائید اسلام کے لئے لکھا تھا، ایسی عظیم الشان کتاب میں قرآن مجید کی آیت

کے حوالے سے ایسا عقیدہ کیوں درج کر دیا جس سے یا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوٰی کا نعوذ باللہ نعوذ باللہ باطل ہونا لازم آتا ہے۔ یا حضرت عیسٰی علیہ السلام کا دروغ گو ہونا ـــــــ پھر یہی الجھن آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرنی چاہیئے تھی کہ آپؐ نے کیوں ارشاد فرمایا کہ ،۔

"نبی علاتی بھائی ہوتے ہیں، ان کی مائیں مختلف ہوتی ہیں اور ان کا دین ایک ہے۔ اور میں سب سے زیادہ قریب ہوں عیسٰیؑ بن مریم سے، کیونکہ میرے اور اس کے درمیان کوئی نبی نہیں ہوا اور وہ ضرور نازل ہونے والا ہے" الخ (النبوۃ فی الاسلام صد ۹۲ از مسٹر محمد علی صاحب لاہوری)

اور پھر آپؐ نے کیوں ارشاد فرمایا کہ ،۔

الا ان عیسٰی بن مریم لیس بینی وبینہ	سن رکھو کہ میرے اور عیسٰی بن مریم کے درمیان
نبی ولا رسول، الا انہ خلیفتی فی امتی	نہ کوئی نبی ہوا نہ رسول۔ سن رکھو کہ وہ میرا خلیفہ ہو
من بعدی۔ (در منثور)	گا میری امت میں میرے بعد۔

کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم نہیں تھا کہ عیسٰی بن مریم (علیہما السلام) کے نزولِ ثانی سے یا تو معاذ اللہ آپؐ کا دعوائے نبوت غلط ہو جائے گا، یا حضرت عیسٰے علیہ السلام کا دروغ گو ہونا لازم آئے گا۔

اور پھر یہی الجھن آپ کو تیرہ صدیوں کے مجددین سے دریافت کرنی چاہیئے تھی کہ وہ باوجود مامور من اللہ اور ملہم و محدث ہونے کے کیوں ایسا عقیدہ رکھتے آئے جس سے بقول آپ کے خدا نخواستہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت یا حضرت عیسٰی علیہ السلام کی صداقت ہی باطل ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب! حضرت عیسٰے علیہ السلام کے رفع و نزول کا عقیدہ اگر غریب یوسف کی اختراع ہوتی تو اس کی جواب دہی بھی اس پر لازم تھی۔ مگر یہ عقیدہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرامؓ اور تیرہ صدیوں کے مجددین کا ہے۔ اس پر آپ کو کچھ اشکال ہے تو قیامت کے دن ان حضرات سے دریافت کر لیجئے گا۔

ہاں اگر آپ یہ کہیں کہ ہمیں نہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ تعلق ہے، نہ ہم صحابہؓ و تابعینؒ کو جانتے ہیں، ہم نہ ہم مجددینِ امت کو مانتے ہیں، اور نہ مرزا غلام احمد صاحب کی "قطبی" کو معتبر سمجھتے ہیں، تب البتہ اس اشکال کا حل واقعی یوسف کے ذمہ ہے۔ کیونکہ وہ آج کے سائنسی دور میں بھی ان تمام حضرات کی پیروی کو ضروری سمجھتا ہے، اور انہی کی پیروی میں یہ "غیر سائنسی" عقیدہ رکھتا ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام زندہ ہیں ـــ اور یہ سرسید اور اس کی اولاد کی نظر میں اتنا بڑا جرم ہے جو کبھی معاف نہیں کیا جانا چاہیئے۔

اگر آپ کا یہی موقف ہے تو لیجئے "الجھن کا حل" بھی پیشِ خدمت ہے۔ آپ نے اپنی عبارت میں "نزولِ اوّل" اور "نزولِ ثانی" کے لفظ استعمال فرمائے ہیں (پلٹ کر اپنی عبارت پھر پڑھ لیجئے) آپ من بعدی کا ترجمہ "میرے نزولِ اوّل کے بعد" کر لیجئے۔ اس کے بعد بتایئے کوئی اشکال باقی رہا؟

تحقیق اس کی یہ ہے کہ انبیاء کرام میں ترتیب زمانی نبوت کے اعتبار ہی سے قائم ہوتی ہے۔ یعنی جس کی بعثت

پہلے ہوئی وہ پہلا نبی ہے، اور جس کی بعثت بعد میں ہوئی وہ بعد کا نبی ہے۔ اور یہ ممکن ہے کہ جس کی بعثت بعد میں ہوئی ہو اس کا انتقال پہلے ہو جائے۔ چنانچہ سیدنا ہارون علیہ السلام کی بعثت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوئی مگر انتقال پہلے ہوا، اب اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد گرامی کا کہ "میرے بعد آئے گا" یہ مطلب لیے جائے کہ اس رسول کی آمد کا نمبر میری بعثت کے بعد ہے، اور میری آمد اس امر کی علامت ہے کہ اب اس آخری رسول کی آمد آمد ہے جس کا اسم گرامی احمد ہو گا، تو آپ ہی فرمائیے کہ اس کے بعد آپ کو الجھن کیوں پیش آتی ہے۔

اور اگر "میرے بعد" سے مراد "میرے رفع کے بعد" لیا جائے تب بھی کوئی اشکال نہیں۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمانی کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد بالکل صحیح ثابت ہوا۔ قرب قیامت میں جب وہ تشریف لائیں گے اس وقت وہ ساری دنیا کے سامنے اعلان کریں گے کہ دیکھو میں نے منادی کی تھی کہ میرے رفع آسمانی کے بعد ایک عظیم الشان رسول آئے گا جس کا اسم گرامی احمد ہو گا۔ دیکھو میری پیشگوئی کے عین مطابق وہ تشریف لائے اور مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں ان کا صحابی ہوں۔ کیونکہ میں نے ان ناسوتی آنکھوں سے شب معراج میں ان کی زیارت کی ہے۔ اور انہی کے ارشاد کے مطابق میں ان کی امت میں ان کا خلیفہ ہوں۔

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عیسٰے علیہ السلام کے بعد ہی تشریف لائے ہیں، خواہ "بعد" سے مراد بعد از بعثت لیا جائے، یا بعد از رفع ـــ دونوں میں کوئی اشکال نہیں ـــ اور آمد ثانی کے موقعہ پر یہ واقعہ ماضیہ حکایت ہوگی، جیسا کہ آج تک ہی ہے۔

آگے چل کر آپ لکھتے ہیں:۔

"ہو سکتا ہے یوسف صاحب یہ کہیں کہ یہ آیت منسوخ تصور ہو گی"

میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں ایسی جاہلانہ بات کہوں جس کا احتمال آنجناب نے تجویز کر کے اس پر کئی سطریں تحریر فرما دیں، میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ اخبار میں نسخ نہیں ہوتا، ورنہ مخبر صادق کا کاذب ہونا لازم آتا ہے۔ اگر مرزا صاحب کے حق میں اگر کہا جائے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس پیشگوئی کو منسوخ سمجھتے ہیں تو بے جا نہیں ہو گا، کیونکہ مرزا صاحب کے نزدیک وہ اس پیشگوئی کا خود مصداق ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"اور اس آنے والے (مرزا صاحب) کا نام جو احمد رکھا گیا ہے وہ بھی اس کے مثیل ہونے کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ محمد جلالی نام ہے اور احمد جمالی۔ اور احمد اور عیسٰے اپنے جمالی معنوں کی رو سے ایک ہی ہیں، اسی کی طرف یہ اشارہ ہے:۔ ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد۔ مگر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فقط احمد ہی نہیں بلکہ محمد بھی ہیں، یعنی جامع جلال وجمال ہیں۔ لیکن آخری زمانہ میں برطبق پیشگوئی مجرد احمد، جو اپنے اندر حقیقت عیسویت رکھتا ہے، بھیجا گیا" (ازالہ ص ۶۷۳۔ طبع اول)

مرزا صاحب اس عبارت میں صاف دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ" یأتی من بعدی اسمہ احمد" کی پیشگوئی کے مطابق بھیجے گئے ہیں۔" کیا مرزا صاحب کے اس دعویٰ کا صاف مطلب یہ نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد احمد نام کے جس شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا وہ نعوذ باللہ اپنے دعویٰ میں صادق نہیں تھا۔ اور یا اس عیسیٰ کا دعویٰ کرنے والے (مرزا غلام احمد) کو کاذب اور مفتری کہا جائے گا۔ کیونکہ احمد نام کے نبی آچکے اور چلے گئے۔ اس الجھن کا حل ڈاکٹر صاحب کیا پیش کر سکتے ہیں"؟۔

خطاب یا حکایت خطاب؟ آگے ارشاد ہوتا ہے۔

"(۲) اس کے بعد ہم ان کی (راقم الحروف کی) خدمت میں سورۂ آلِ عمران کی آیت ۵۵ پیش کرتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا...... یہ آیت نزولِ ثانی کے وقت بھی قرآنِ کریم میں موجود ہوگی، اللہ تعالیٰ پھر انہی الفاظ میں حضرت مسیحؑ سے مخاطب ہوگا...... مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلا رفع تو نزولِ ثانی کے لئے ہوا، اب اس کے بعد دوسری بار آسمان پر اٹھائے جانے کا کیا مقصد ہوگا......" (ص ۴)

ڈاکٹر صاحب! آپ بھولتے ہیں۔ آیت اذ قال اللہ یٰعیسیٰ انی متوفیک میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو مخاطب نہیں فرمایا، بلکہ نزولِ آیت سے چھ سو سال پہلے جو خطاب ان سے فرمایا تھا بطور حکایت اس کو نقل کیا ہے۔ یہ خطاب اس وقت ہوا تھا جب یہود بے بہبود آپ کے خلاف سازشیں کر رہے تھے، ان کی سازش کو ناکام بنانے کے لئے خدا تعالیٰ نے جو "خفیہ منصوبہ" تیار کر رکھا تھا اس کی اطلاع اس خطاب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھی، کہ اے عیسیٰ! آپؑ ان کی ریشہ دوانیوں سے مشوش نہ ہوں، میں آپ کو ان کے درمیان میں سے وصول کر کے آسمان پر اٹھالوں گا اور ان کافروں کے ناپاک ہاتھوں کی رسائی سے آپؑ کو پاک رکھوں گا۔ الخ

ظاہر ہے کہ نزول کے بعد نہ یہود ہوں گے، نہ ان کا مکر ہوگا، نہ اس سے بچانے کے لئے خدا تعالیٰ کے فوق العادۃ خفیہ منصوبے (رفعِ آسمانی) کی ضرورت ہوگی، نہ خطاب ہی دوبارہ ہوگا۔ ہاں! خطابِ اول کی حکایت ہمیشہ باقی رہے گی ——— ڈاکٹر صاحب! کیا یہی قرآن فہمی ہے جس کے برتنے پر عیسےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی موت کا شور مچایا جاتا ہے؟ ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

غلبۂ اسلام آپ فرماتے ہیں:-

"خدا کا خوف کیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے اولوالعزم نبی کے دستِ مبارک پر تو یہ نہ ہو کہ اسلام کے تمام مذاہب ختم ہو جائیں، لیکن حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر یہ ہو جائے گا۔ اس طرح آپ کس کو فضیلت دے رہے ہیں، حضرت عیسےٰ علیہ السلام کو یا آں حضرتؐ کو؟" (ص ۴)

ڈاکٹر صاحب! آپ خوفِ خدا کی تلقین سب سے پہلے تو مرزا غلام احمد کو کیجئے کہ انہوں نے اپنی "دو غلطی" ہیں کیوں تحریر فرمایا کہ "جب حضرت مسیح دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے تو ان کے ہاتھ سے دینِ اسلام جمیع آفاق و اقطار میں پھیل جائے گا" (براہینِ احمدیہ ص ۴۹۹)

اور مرزا صاحب سے فارغ ہو کر اگر آپ میں مزید ہمت ہو تو پھر خوفِ خدا کی تلقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی فرمایئے کہ آپؐ نے کیوں ارشاد فرمایا کہ ویھلك الملل کلھا إلا الإسلام۔ یہ اسی حدیث کا فقرہ ہے مسٹر محمد علی صاحب لاہوری نے "النبوۃ فی الاسلام" کے صفحہ ۹۲ پر نقل فرمائی ہے، اور اس کا ترجمہ وہی ہے جس پر آپ مجھے خوفِ خدا کی تلقین کر رہے ہیں۔

کون سچا؟ | اسی سلسلہ میں آپ نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ:

"کون سچا ہے، خدا یا آپ؟" "ہم کس کی گواہی مانیں، آپ کی یا اللہ کی؟"

میں وضاحت کر چکا ہوں کہ ہمارا عقیدہ تو فرمودۂ خدا و رسولؐ کے تابع ہے۔ اب یہ آپ ہی بتائیں کہ اللہ تعالےٰ اور رسولِ کریمؐ سچے ہیں یا مرزا غلام احمد؟ اور ہم کس کی گواہی مانیں، خدا و رسولؐ اور مجددینِ امت کی، یا مرزا صاحب کے الہام اور فہم کی؟

یاد رکھئے! | اسی سلسلہ میں آپ نے یہ غلام احمدانہ پیش گوئی بھی فرمائی ہے کہ:-

"یاد رکھئے یہ غلبہ آنحضرتؐ کے ہی ہاتھوں آپ کے ایک غلام، اُمتی اور کامل متبع کے ذریعہ مقدر ہے جسے آپ نے خود مسیح کا نام دیا ہے، آپ کی نسلیں انتظار کرتے کرتے گزر جائیں گی مگر وہ اسرائیلی نبی کبھی نہیں آئے گا" (ص ۷)

آپ مطمئن رہیں اگر بیسیوں نسلیں بھی گزر جائیں تب بھی قیامت سے پہلے وہ مسیح ضرور آئے گا جس کا وعدہ خدا ا رسولؐ نے فرمایا ہے، یہ خدا اور رسولؐ کی پیشگوئی ہے جو کبھی ٹل نہیں سکتی۔ مرزا صاحب کی محمدی بیگم والی "الہامی پیشگوئی" نہیں کہ تھک ہار کر مرزا صاحب کو اس کے منسوخ ہونے کا اعلان کرنا پڑے۔ ہاں آپ کی پیشگوئی (جو دراصل مرزا صاحب کی پیشگوئی ہے) کے مقابلہ میں بحول اللہ و قوتہ میں پیشگوئی کرتا ہوں کہ "آپ کی نسلیں انتظار کرتے کرتے گذر جائیں گی مگر مرزا صاحب کی جماعت کو انشاء اللہ کبھی غلبہ نہ ہو گا، بلکہ جس طرح وہ ایک صدی سے ناکام و نامراد چلے آتے ہیں آئندہ صدیوں میں انشاء اللہ اس سے بڑھ کر ناکام ہوں گے"۔

ڈاکٹر صاحب! ایک اور عقدہ بھی حل فرمایئے! اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمائیں کہ "عیسیٰ بن مریم کے نزول کے زمانہ میں تمام مذاہب مٹ جائیں گے، صرف اسلام باقی رہے گا" تو اس پر تو آنجناب خوفِ خدا کی تلقین فرماتے ہیں کہ "اس طرح آپ کس کو فضیلت دے رہے ہیں حضرت عیسٰےؑ کو یا آنحضرتؐ کو" ـــــــ لیکن یہی غلبۂ اسلام جب آپ لوگ جناب مرزا صاحب کی طرف منسوب کرتے ہیں اس وقت آپ کو خدا کا خوف نہیں آتا کہ اس طرح آپ مرزا غلام احمد کو فضیلت دے رہے ہیں یا آنحضرتؐ کو؟

ڈاکٹر صاحب! کیا یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے یہودیانہ بغض نہیں کہ جو منقبت مرزا کے لئے جائز، وہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے حق میں ناقابلِ برداشت! عیسیٰ علیہ السلام اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے نائب، خلیفہ، امتی، تبیع بن جائیں (یا قرآن و حدیث ان کی اس حیثیت کو بیان کریں) تو امتِ مرزائیہ پر قیامت ٹوٹ جاتی ہے، لیکن اگر مرزا صاحب، اتباعِ رسولؐ کی سیڑھی سے نبوت تک بھی پہنچ جائیں تو مرزائی امت کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام تشریف لاکر اپنی تمام قوم کو اسلام کا حلقہ بگوش اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام بنا دیں تو آپ کو توہینِ رسولؐ نظر آتی ہے، اور مرزا صاحب آتھم کو بھی راہِ راست پر لانے میں ناکام رہیں تب بھی آپ کے خیال میں "اسلام کو غلبہ" نصیب ہو جاتا ہے ــــ مرزا صاحب آپ کے مجدد سہی، مگر عیسےٰ علیہ السلام سے اتنا بغض آپ لوگوں کو کیوں ہے؟ عیسےٰ علیہ السلام نے آخر آپ لوگوں کا کیا بگاڑا ہے؟ ان کا "جرم" اس کے سوا کیا ہے کہ وہ عہدِ خداوندی کے ماتحت ابھی زندہ ہیں، اور اپنے مقررہ وقت تک زندہ رہیں گے اور جب تک وہ زندہ ہیں بدقسمتی سے مرزا صاحب کی مسیحیت کا سکہ نہیں چل سکتا۔

قد خلت کی بحث آپ نے قرآن کریم کی دو آیتوں (ما المسیح بن مریم الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل (المائدہ) اور (ما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل۔ آل عمران) کا ترجمہ کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

> "اس آیت میں "قد خلت" کی تفسیر قرآن کریم نے "افائن مات او قتل" سے کر دی ہے۔ اب عقل یہی کہتی ہے کہ اگر حضرت عیسیٰؑ سے پہلے رسول قد خلت کے مطابق مر چکے ہیں تو انہی الفاظ کے مطابق آنحضرت صلعم سے پہلے تمام رسول مر چکے ہیں، اور حضرت عیسیٰؑ ان میں شامل ہیں، اور یہ کوئی اصول نہیں کہ الفاظ کے معنی ایک جگہ تو مرنے کے کئے جائیں اور دوسری جگہ اپنا مطلب حل کرنے کے لئے اپنی مرضی کے مطابق آسمان پر اٹھایا جانا کئے جائیں۔" (صفحہ ۴)

عقل تو جو کچھ کہتی ہے وہ ابھی عرض کرتا ہوں، پہلے یہ تو فرمایئے کہ آپ نے قد خلت من قبلہ الرسل کا ترجمہ پہلی جگہ تو یہ کیا کہ "اس سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں" اور دوسری جگہ اسی فقرہ کا ترجمہ یہ کیا کہ "اس سے پہلے سب رسول گزر چکے ہیں" آخر یہ کیا اصول ہے کہ ایک ہی فقرے کا ترجمہ اپنا مطلب حل کرنے کے لئے کبھی کچھ کیا جائے اور کبھی کچھ اور کر لیا جائے؟

اوپر عرض کر چکا ہوں کہ مرزا صاحب مجدد، ملہم اور مامور من اللہ ہونے کے باوجود براہینِ احمدیہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ آنے کی خوشخبری دے رہے تھے۔ کیا اس وقت یہ دونوں آیتیں قرآن مجید میں موجود نہیں تھیں؟ یا مرزا صاحب کو "علمِ لدنی" اس وقت تک حاصل نہیں ہوا تھا؟ اور ان پر مغزِ شریعت نہیں کھلا تھا؟ اور پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہود سے یہ فرما رہے تھے کہ "عیسےٰ علیہ السلام مرے نہیں، اور وہ دوبارہ تشریف لائیں گے"۔ (تفسیر ابن کثیر) کیا آپؐ کو بھی یہ خبر نہیں تھی کہ یہ دونوں آیتیں "سب رسولوں کی موت" کو ثابت کرتی ہیں۔

اور پھر جب عیسٰی علیہ السلام انبیاء کرام کی مجلس میں یہ فرما رہے تھے کہ "اللہ تعالیٰ کا مجھ سے عہد ہے کہ قربِ قیامت میں دجال نکلے گا تو میں نازل ہو کر اسے قتل کروں گا۔" (ابن ماجہ ص ۲۹۹) کیا اس وقت حضرت عیسٰی علیہ السلام کو خبر نہ تھی کہ میں تو قد خلت کے مطابق مر چکا ہوں۔ اور اللہ تعالےٰ جب حضرت عیسٰی علیہ السلام سے یہ عہد کر رہے تھے کیا اس وقت قد خلت کی یہ تفسیر اسے بھی معلوم نہ تھی؟

ڈاکٹر صاحب! کیا عقل یہی کہتی ہے کہ قرآن مجید کی کسی آیت یا لفظ کے ایسے معنی کئے جائیں جن کی نہ خدا کو خبر ہو، نہ جبریل کو، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو، نہ حضرت عیسٰے علیہ السلام کو، اور نہ آپ کے مجدد صد چہاردہم کو؟ یعنی اقبال مرحوم کے الفاظ میں، ؎

وے تاویل شاں در حیرت انداخت
خدا و جبریلؑ و مصطفٰیؐ را

ڈاکٹر صاحب! قَدْ خَلَتْ کے معنی مرنے کے نہیں، ہو گزرنے کے ہیں۔ چنانچہ آنجناب نے بھی اس کا ترجمہ "گذر چکے ہیں" ہی کیا ہے۔ اور زمین سے گذر جانا جس طرح موت کی صورت میں صادق آتا ہے، اسی طرح رفع آسمانی کی صورت میں بھی صادق آتا ہے، جب قرآنِ کریم، حدیثِ نبوی، اور تیرہ صدیوں کے تمام ائمہ ہدیٰ حضرت عیسٰے علیہ السلام کے رفع آسمانی کے قائل ہیں تو ان کے حق میں قَدْ خَلَتْ کی وہ عجیب وغریب تفسیر کرنا، جو مرزا صاحب اور مرزائی صاحبان کی اختراع ہے، عقل و دانش نہیں، بلکہ تحریف و الحاد ہے۔

ڈاکٹر صاحب! سورۃ المائدہ کی آیت ۷۵ ما المسیح بن مریم الا رسول، قد خلت من قبلہ الرسل کو آپ مرزا غلام احمد کی پیروی میں موت مسیح کی دلیل ٹھہراتے ہیں، حالانکہ بشرط عقل و انصاف یہ موتِ مسیح کی نہیں بلکہ حیاتِ مسیح کی دلیل ہے، کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ آیت عیسائیوں کے عقیدہ الوہیتِ مسیح کی تردید کے لئے نازل ہوئی ہے، جیسا کہ سیاق وسباق سے واضح ہے، قرآنِ کریم کا مدعا یہ ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام صرف رسول ہیں، خدا نہیں، اور ان کی رسالت و نبوت بھی کوئی انوکھی چیز نہیں، بلکہ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گذر چکے ہیں، جن خوارق اور معجزات کی بنا پر عیسائیت انہیں خدا تصور کرتی ہے، ایسے معجزات اور خرق عادات امور انبیاء گذشتہ کے ہاتھ پر بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں۔ اس کے باوجود انبیاء گذشتہ کے بارے میں کسی کو الوہیت کا وہم نہیں ہو سکتا، حتیٰ کہ خود عیسائی بھی ان معجزات کے باوجود انہیں رسول ہی سمجھتے ہیں، خدا نہیں مانتے۔ پھر مسیح کی کیا خصوصیت ہے کہ انہیں خوارق و معجزات کی بناء پر "خدا" تصور کیا جائے۔

یہ ہے قرآن کریم کا استدلال جس سے عیسائیوں کے دعوئ الوہیتِ مسیح کو باطل کیا گیا ہے، اب اگر ڈاکٹر صاحب کے بقول قد خلت من قبلہ الرسل کے معنی یہ لئے جائیں کہ "اس سے پہلے سب رسول مر چکے" تو یہ متعدد وجوہ سے باطل ہے۔

اول:- اگر نزولِ آیت کے وقت مسیح علیہ السلام زندہ نہیں تھے تو قرآنِ کریم ان کی الوہیت کے ابطال کیلئے

ایک سیدھی سی بات کہتا کہ "مسیح مر چکا ہے"۔ مرزا غلام احمد صاحب کے نزدیک موت مسیح، کسرِ صلیب کا آسمانی حربہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ "آسمانی حربہ" قرآنِ کریم نے کیوں استعمال نہ کیا، جبکہ اس موقعہ پر قرآنِ کریم کا مقصد ہی الوہیتِ مسیح کا ابطال تھا۔

ڈاکٹر صاحب کو شاید علم ہو گا کہ نجران کے عیسائیوں کا وفد جب بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہوا، اور الوہیتِ مسیح پر گفتگو ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

الا تعلمون ان ربنا حیّ لا یموت وان عیسیٰ یأتی علیہ الفناء (درمنثور)　　　کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب زندہ ہے کبھی نہ مرے گا، اور یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام پر موت آئے گی۔

آپ دیکھتے ہیں کہ اس مباحثہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی مرزا صاحب کا خود ساختہ آسمانی حربہ استعمال نہیں فرماتے، اور عیسائیوں کو یہ کہہ کر ملتزم نہیں کرتے کہ "عیسٰے مر چکا ہے"؛ بلکہ اس کی بجائے یہ فرماتے ہیں کہ زمانۂ مستقبل میں ان کو موت آئے گی۔ پس قرآنِ کریم کا الوہیتِ مسیح کے ابطال کے لئے پہلے رسولوں کی نظیر پیش کرنا اور خود موتِ مسیح کی تصریح نہ کرنا، ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانۂ مستقبل میں مسیح پر موت آنے کو ذکر کرنا اور یہ نہ فرمانا کہ زمانۂ ماضی میں مسیح مر چکا ہے، اس امر کی صاف دلیل ہے کہ اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مسیح علیہ السلام ابھی تک زندہ ہیں۔

دوم:۔ قد خلت من قبلہ الرسل کا ترجمہ یہ کیا جائے کہ "اس سے پہلے سب رسول مر چکے ہیں" تو اس سے لازم آئے گا کہ حضرت مسیح اور آنحضرت (صلی اللہ علیہما السلام) رسول نہیں، کیونکہ "سب رسول" تو مسیح سے پہلے مر چکے۔

سوم:۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وصالِ نبویؐ کے موقع پر فرمایا تھا کہ "انہ سیرجع کما یرجع عیسیٰؑ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح واپس آئیں گے جیسا کہ عیسٰے واپس آئے گا") (خطبہ الہامیہ مصنفہ مرزا غلام احمد ص۱۴۹) اور وہ آسمان کی طرف ایسا ہی زندہ اٹھائے گئے ہیں جیسے کہ عیسٰے بن مریم اٹھایا گیا"۔ (تحفہ گولڑویہ ص) اور سب جانتے ہیں کہ مشبہ بہ ہمیشہ مسلّم اور مشہور ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عیسٰے علیہ السلام کا آسمان پر زندہ اٹھایا جانا اور واپس آنا تمام صحابہ کو مسلّم تھا اور ان میں مشہور تھا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ صحابہؓ کو یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے معلوم ہوئی ہوگی۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں صحابہ کرامؓ کے پاس آپؐ کی ذاتِ گرامی کے سوا اور کوئی ذریعۂ علم نہیں تھا، پس حیاتِ عیسٰے علیہ السلام کا مسئلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کا اجماعی تھا۔ اور "سب رسول مر چکے"۔ کے عقیدے سے لازم آتا ہے کہ یہ سب حضرات باطل پر متفق تھے۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

چہارم:۔ حضرت عمرؓ علی الاعلان حضرت عیسٰے علیہ السلام کی واپسی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی کو قیاس کرتے ہیں، لیکن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا تو برسرِ منبر اعلان کرتے ہیں فان محمداً قد مات، مگر عیسٰے علیہ السلام کی وفات کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں فرماتے، اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اعلان، دربارۂ رجوع عیسٰےؑ

غلط ہوتا تھا اس کی برملا تردید کی جاتی۔

اس سے واضح ہوا کہ حضرت عیسٰے علیہ السلام کی واپسی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھی مسلم تھی۔ پس سب سے پہلا اجماع اس پر منعقد ہوا کہ عیسٰی علیہ السلام زندہ ہیں اور وہ دوبارہ تشریف لائیں گے۔

اس تحقیق کے بعد اگر یہ کہا جائے تو بالکل بجا ہوگا کہ حیاتِ عیسٰے علیہ السلام کے مسئلہ میں مرزا صاحب کو خدا تعالٰے سے بھی اختلاف ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی، صحابہ کرامؓ سے بھی، اور تیرہ سو سالہ محدثین، مجددین اور ائمہ ہدیٰ سے بھی۔ اب ڈاکٹر صاحب اور ان کی جماعت کو اختیار ہے کہ وہ ان سب کو چھوڑ کر مرزا صاحب کی سخن سازیوں پر ایمان لائیں۔ یا مرزا صاحب کی من مانی تاویلات پر دو حرف بھیج کر صراطِ مستقیم کو اپنائیں۔ ہمارے اختیار میں جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ ان کے سامنے صراطِ مستقیم کی وضاحت کر دیں، اور ان کے شبہات کا ازالہ کر دیں، ہدایت دینا خدا تعالٰے کے قبضہ میں ہے اور جب تک کوئی شخص ہدایت کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہ ہو تب تک اسے ہدایت میسر نہیں آتی۔

ڈاکٹر صاحب نے جناب مرزا غلام احمد صاحب کی تقلید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرامؓ، مجددینِ اُمت اور امتِ مسلمہ کو عقیدۂ حیاتِ مسیحؑ کے جرم میں "مشرک" کا خطاب بھی دیا ہے وہ لکھتے ہیں :۔

"اگر آپ کے عقیدہ کے مطابق وہ (حضرت عیسٰی علیہ السلام) حوائجِ بشریہ سے بے نیاز اور اللہ تعالٰے کے ارشاد کے برعکس آج دو ہزار سال سے آسمان پر زندہ موجود ہیں تو آپ مسیح علیہ السلام میں خدائی صفات کے قائل ہیں، اور یہ شرک ہے، اور اس حقیقت کے انکشاف کے بعد بھی اگر آپ ان کو زندہ تسلیم کرتے ہیں تو آپ "مشرک" ہیں۔ (صہ)

لاہوری مرزائی کہا کرتے ہیں کہ ہم کلمہ گو مسلمانوں کو کافر نہیں کہتے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ دعوٰی غلط ہے چنانچہ ڈاکٹر صاحب حیاتِ عیسٰےؑ کے قائلین کو بلا تکلف "مشرک" کہتے ہیں۔ کیا ڈاکٹر صاحب وضاحت فرمائیں گے کہ مشرک اور کافر کے درمیان کیا فرق ہے؟ اور یہ کہ "مشرک" بھی کافر ہی ہوتا ہے یا وہ پکا مسلمان ہوتا ہے؟

جو شخص کسی زمانے میں مرنے والا ہو اس کی زندگی کے وقفہ کو ــ خواہ وہ مختصر ہو یا طویل ــ خدائی کی دلیل ٹھہرانا یا تو قدیم عیسائیوں کا کام ہے یا مرزا غلام احمد کو "مسیح" ماننے والے جدید مسیحیوں کا۔ ورنہ دنیا کا کوئی عاقل کسی فانی کے بقیدِ حیات ہونے کو اس کی خدائی کی دلیل نہیں ٹھہرا سکتا۔

جناب ڈاکٹر صاحب! اگر کسی کی طویل زندگی ہی اس کی خدائی کی دلیل ہے تو غالباً آنجناب فرشتوں کو تو مسیحؑ سے بھی بڑا خدا سمجھتے ہوں گے۔ کیونکہ ان کی زندگی کا وقفہ تو مسیح علیہ السلام سے بہت ہی طویل ہے، وہ آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے موجود تھے، اور قیامت تک زندہ رہیں گے۔ اور پھر آنجناب معلم ملکوت (ابلیس) کو شاید ان سے بھی بڑا خدا سمجھیں گے کیونکہ اس کی حیات کا وقفہ مہلت تو وقتِ یوم معلوم تک نصِ قرآن سے ثابت ہے، اور شیطان، جناب مرزا صاحب کے زمانہ میں بھی زندہ تھا، چنانچہ مرزا صاحب نے فرمایا کہ :۔

"اصل میں ہمارا وجود دو باتوں کے لئے ہے، ایک تو نبی کو مارنے کے لئے، دوسرا شیطان کو مارنے کے لئے"
(ملفوظات مرزا غلام احمد ج ۱۰ صفحہ ۶، مطبوعہ ربوہ)

معلوم نہیں کہ آجکل بھی شیطان زندہ ہے یا مرزا صاحب اس کو مار چکے ہیں۔ بہرحال اگر ڈاکٹر صاحب کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دو ہزار سال سے زندہ ہونا ان کی خدائی کی دلیل ہے اور اس وجہ سے امت مسلمہ ان کے نزدیک مشرک ہے تو انہیں مبارک باد دیتا ہوں کہ یہ "مقدس شرک" ان کا خانہ زاد ہے۔

ڈاکٹر صاحب! آپ کا قصور نہیں، مرزا غلام احمد کو "مسیح" اور "مہدی" ماننے کا کرشمہ ہے کہ آدمی عقل و فہم کی اس سطح پر آجائے، جس شخصیت کے بارے میں ہم اعلان کرتے ہیں کہ ثم یموت و یدفن (پھر وہ مرے گا اور دفن ہوگا) اس کے بارے میں ہمیں آپ یہ طعنہ دیتے ہیں کہ تم مشرک ہو، تم اس میں خدائی صفات مانتے ہو۔ ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

ڈاکٹر صاحب! حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے رفع و نزول میں ایک سلیم العقل مومن کے لئے ذرا بھی اشکال نہیں، نہ سرسید اور مرزا غلام احمد سے پہلے کسی کو اشکال پیش آیا، ہاں جب دل سے خدا اور رسول ﷺ کی عظمت ہی رخصت ہو جائے تو صاف اور سیدھی بات میں بھی احتمالات و اشکالات پیدا کر لینا مشکل نہیں، خدا تعالیٰ زیغ و ضلال سے بچائے اور سلف صالحین کے راستہ پر چلائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مضمون ختم کر چکا تھا خیال آیا کہ ڈاکٹر صاحب سے بے انصافی ہوگی اگر ان کے اس شعر سے تعرض نہ کیا جائے جو ان کے مضمون کا زیب عنوان ہے، یعنی

"غیرت کی جا ہے عیسےٰ زندہ ہو آسماں پر
مدفون ہو زمین میں شاہ جہاں ہمارا"

واقعی بڑی غیرت کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے شاہجہان جناب مرزا غلام احمد صاحب، جن کے بارے میں لولاک لما خلقت الافلاک کی وحی قادیان شریف میں نازل ہوئی، وہ تو زیر زمین مدفون ہوں اور حضرت عیسےٰ علیہ السلام، جن کو مارنے کے لئے مرزا صاحب نے ساری عمر کھپا دی، وہ آسمان پر زندہ ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو پھر ایک اولوالعزم رسول تھے، ان کی زندگی سے بڑھ کر غیرت کی بات یہ ہے کہ مرزا صاحب زیر زمین مدفون قادیان ہیں اور ڈاکٹر صاحب اور ان کی جماعت کے لوگ زمین پر زندہ پھرتے اور ہوائی جہاز میں کئی ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتے پھرتے ہیں۔ اور ڈاکٹر صاحب تو خیر پھر انسان ہیں، اس سے بڑھ کر غیرت کی بات یہ ہے کہ چیل کوّے تو فضاؤں کو چیرتے ہیں اور مرزا صاحب "مالک لولاک" زیر زمین مدفون ہیں۔ اس سے بڑھ کر غیرت کی بات یہ ہے کہ شیطان، خنزیر اور کتے تو زمین کو پامال کر رہے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کے شاہ جہان صاحب زیر زمین ہیں۔

بلاشبہ یہ سب باتیں غیرت انگیز ہیں اور ڈاکٹر صاحب اس سلسلہ میں ہماری ہمدردی کے مستحق ہیں، لیکن

ہمیں ان سے شکایت یہ ہے کہ ان کی غیرت صرف عیسٰے علیہ السلام کا نام سن کر کیوں بیدار ہو جاتی ہے، اور باقی ساری دنیا کے زمین پر یا آسمان پر زندہ ہونے سے ان کی غیرت کو کیوں انگیخت نہیں ہوتی۔

مرزا غلام احمد کے نزدیک حضرت موسٰی علیہ السلام بھی آسمان پر زندہ ہیں اور اس پر ایمان لانا واجب ہے چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"یہ وہی موسٰی مردِ خدا ہے، جس کی نسبت قرآن میں اشارہ ہے کہ وہ زندہ ہے، اور ہم پر فرض ہو گیا کہ ہم اس بات پر ایمان لاویں کہ وہ زندہ آسمان میں موجود ہے اور مردوں میں سے نہیں"

(نور الحق ج ۱ ص ۵۱)

لیکن حضرت موسٰی علیہ السلام کے آسمان پر زندہ ہونے کا سن کر ڈاکٹر صاحب کی غیرت کو کوئی جنبش نہیں ہوتی۔ اور جونہی عیسٰی علیہ السلام کا نام آتا ہے ڈاکٹر صاحب کی غیرت پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ حضرت عیسٰے علیہ السلام، ان کے مسیح موعود کے رقیب ہیں، اور رقابت کے معاملہ میں احساسات یہاں تک نازک ہوا کرتے ہیں کہ:۔

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی
گو مشتِ خاکِ ما ہم برباد رفتہ باشد

اور

باسایہ ترا نمی پسندم
عشق است و ہزار بدگمانی

اس لئے اگر حضرت عیسٰی علیہ السلام کی پرچھائیں بھی کہیں پڑ جاتی ہیں تو ڈاکٹر صاحب کو ہزار ہزار بدگمانیاں لاحق ہو جاتی ہیں، کہ کہیں لیلائے مسیحیت محلۂ قادیاں سے رخصت نہ ہو جائے۔

معزز قارئین سے کئی ماہ سے پرچہ کی اشاعت میں بوجوہ تاخیر ہو رہی ہے تاہم ہماری سعی ہوتی ہے کہ درمیانی وقفہ ایک ماہ سے زیادہ نہ ہو مہینوں کے لحاظ سے قارئین کو کچھ بے ترتیبی محسوس ہو رہی ہے مگر ہماری گذارش ہے کہ پرچہ کی ترتیب مہینوں سے نہیں رسالہ پر لکھے ہوئے نمبر شمار سے لگایا کریں بعض دفعہ رسالہ پر مہینے کا نام دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ مجھے ہی تاخیر سے بھیجا گیا حالانکہ پرچہ آتے ہی بیک وقت ایک ہی دن میں سپرد ڈاک کیا جاتا ہے۔ یہ پرچہ صفحات بڑھا کر شائع کیا جا رہا ہے کہ انتظار کی تلافی ہو سکے۔ بہت سے قارئین نہ خریداری نمبر لکھتے ہیں نہ منی آرڈر کوپن پر وضاحت سے کچھ لکھتے ہیں آئندہ ایسے حضرات سے الحق اپنا تعلق برقرار رکھنے سے معذور ہو گا۔ (ادارہ)

جناب مضطر عباسی ایم۔ اے ۔ مری

جدید زبانوں کے عربی ماخذ

مسلسل

اَ ۔ نافیہ :۔۔۔ دنیا کی بیشتر زبانوں کے حروف تہجی میں پہلا حرف الف۔ اَ ۔ A ہے۔ یوں تو حروف تہجی بے معنیٰ ہوتے ہیں۔ مثلاً اردو میں پانی۔ فارسی میں آب انگریزی میں WATER اور اسپرانتو میں AKVO ہے، ان کلمات میں پ۔ ا۔ ن۔ ی۔ یا آ۔ ب۔ اور اسی طرح R-E-T-A-W اور V-K-A اور O ۔میں سے کسی حرف کے کوئی معنیٰ نہیں، بلکہ ب۔ ا۔ ن۔ ی۔ کے مرکب کلمہ "پانی" کے معنی ہیں، یہی حال کلمہ "آب" کا ہے۔ آ اور ب کے معنیٰ نہیں بلکہ مرکب کے معنیٰ ہیں۔۔۔۔۔

جس طرح زبانوں اور کسی زبان کے کلمات میں سے ہر کلمہ کی مستقل تاریخ ہے۔ اسی طرح حروف تہجی میں سے ہر حرف کی بھی مستقل تاریخ ہے۔ یہ تاریخ نہایت دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ اہل تحقیق کا خیال ہے کہ ہر حرف تہجی کے ایک خاص معنیٰ بھی ہیں۔ گو یہ معنیٰ کلمہ میں مستعمل نہیں۔ مثلاً عربی کے حروف تہجی میں "ع" ایک حرف ہے۔ اس کا نام "عین" ہے۔ اور "ع" کے معنیٰ "آنکھ" "چشم" یا EYE اور OKULO ہیں۔ پانی کے چشمہ کو بھی عربی میں "عین" کہتے ہیں، لیکن کلمہ "علم" میں "ع" کے الگ کوئی معنیٰ نہیں ہیں۔

حرف "ع" سے ایک دلچسپ بات یاد آئی۔ چاہتا ہوں اس دلچسپی میں آپ بھی شریک ہوں۔ عربی کے موجودہ رسم الخط میں کلمہ "مَعَ" یا "جامعہ" کی صورت ملاحظہ فرمائیں اس میں "ع" بالکل آنکھ کی طرح نظر آرہا ہے۔ گویا آنکھ کی تصویر ہے۔ عربی رسم الخط عبرانی سے ماخوذ تو نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک زمانے میں یہ دونوں زبانیں ایک ہی رسم الخط میں لکھی جاتی رہی ہیں۔ عبرانی میں "ع" کی صورت "ע" ہے۔ گویا عربی کے "ع" کا سرا اوپر کیطرف ہے۔ اور ذرا لاطینی یا رومی رسم الخط میں E پر نظر ڈالیں چھپائی کے موجودہ حروف سے قطع نظر کرکے لکھائی کے حروف میں دیکھیں تو E جو EYE کا پہلا حرف ہے۔

" ع " یعنی عربی کا " ع " نظر آتا ہے۔ اور یہی لکھائی کا " ع " چھپائی کے حروف میں کاٹ چھانٹ کے بعد E بن گیا ہے۔ یاد رہے کہ عبرانی میں بھی لا یعنی " ع " کی آواز (عین) کے معنیٰ آنکھ ہی کے ہیں۔

ہاں! تو بات یہ ہو رہی تھی، کہ حروف ہجی کے الگ الگ معنیٰ ممکن تو ہیں لیکن یہ معنیٰ مراد نہیں لئے جاتے۔ لیکن بعض حروف ایسے ہیں جو ایک طرف حروف تہجی کی حیثیت سے استعمال ہوتے ہیں اور دوسری طرف الگ بامعنیٰ کلمہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس طرح " ب " جو کلمہ " بعد " یا " باب " میں الگ کوئی معنوی حیثیت نہیں رکھتی لیکن " باللہ " اور " بسم اللہ " میں مستقل بامعنیٰ کلمہ ہے۔ یہی حال ہمارے زیرِ بحث حرف " اَ " یا " A " کا ہے۔ اس کے مختلف معانی مراد لئے گئے ہیں اور بطور حروف ہجی بھی مستعمل ہے۔ معانی کے اعتبار سے اَ یا A کی مختلف صورتیں ہیں ان میں سے ایک صورت نفی کے معنوں کی ہے۔

اردو میں " اَپھل " اس درخت کو کہتے ہیں جو " پھل " نہ دے۔ اسی طرح اَمَر کے معنیٰ ہیں ہمیشہ زندہ رہنے والا جو مر نہ سکے " الگ " وہ جو دور یعنی " لگا " ہوا نہ ہو۔ یورپ والوں نے ATOM میں A کو نافیہ تسلیم کیا ہے جس کے معنیٰ ہیں " ناقابل تقسیم " TOM تقسیم ہونے والا اور ATOM تقسیم نہ ہونے والا یہ " اَ " یا A کبھی " ن " اور " N " کے ساتھ مل کر بھی نفی کے معنیٰ دیتا ہے۔ اردو میں " انجان " اور " انمٹ " اس کی مثالیں اور یورپ والوں کے ہاں اس کی مثال ANARCHY " انارکی " میں ملتی ہے۔ یہ لفظ یونانی زبان کے دو کلمات AN اور ARCHE سے مرکب ہے۔ AN کے معنیٰ ہیں بغیر نہیں، نا، یا نہ، اور ARCHE کے معنیٰ ہیں حکمران، بڑا، سردار عیسائیوں کے ہاں ARCHBISHOP کے معنیٰ ہیں بڑا پادری، پادریوں کا سردار، گویا ARCHE جس کا تلفظ کہیں " آرک " اور کہیں " آرچ " ہے۔ سردار کے معنیٰ دیتا ہے۔ اور شروع میں AN (اَن) کے آجانے سے ANARCHY کے معنیٰ ہوئے ایسی حالت جس میں کوئی سردار کوئی بڑا اور کوئی حکمران نہ ہو۔ مختصر یہ کہ اَن یا AN نافیہ ہے۔ " اِن انتم اِلا فی ضلال " میں اِنْ نافیہ ہے۔ یہی ان۔ AN کبھی قلب ہو کر " نا " بن جاتا ہے جس سے ہمارا کلمہ " ناکمل " اور " نادان " ہے۔ اور یوں بھی ہوتا ہے کہ اَ A حذف ہو کر صرف " ن " رہ جاتا ہے۔ جو " نکما " اور " نکھٹو " میں نظر آتا ہے۔

اہل یورپ نے جہاں A کے ساتھ " N " کا اضافہ کر کے نفی کا کلمہ بنایا ہے۔ وہاں A کے ساتھ " M " کا اضافہ کر کے بھی یہی مفہوم اخذ کیا ہے۔ پھر A نافیہ کو عربی کے اَ یا ہمزہ (ء) سے ماخوذ تصور کر کے " لا " اور " نا " سے بھی یہی کام لیا ہے۔ UNFIT اور UNDO یا IMMATURE اور

IMMOBILE میں UN (اَن) اور IM (اِم) کے کلمات نافیہ ہیں۔

اَ یا A کی بحث طویل ہو گئی ہے۔ میرا ارادہ جس کلمہ کی طرف توجہ دلانے کا تھا وہ یورپ کی بہت سی زبانوں کا مشترک لفظ ABADON یا ABADDON ہے۔ اس کے معنیٰ دوزخ، جہنم، نیست و نابود اور ختم ہو جانے کے ہیں۔ اہلِ یورپ نے یہ لفظ عبرانی زبان کے کلمہ ABAD سے لیا ہے جو عربی کے لفظ "بَدَأ" کے شروع میں A نافیہ لگا کر بنایا گیا ہے۔ خود عربوں کے ہاں بھی "اَبَدْ" موجود ہے۔ "بَدَاء" کے معنیٰ آغاز اور ابتداء کے ہیں۔ اور اَبَدْ کے معنیٰ انتہاء کے ہیں، ایسی انتہاء کہ جب کچھ نہ رہے یعنی عدمِ محض اور ظاہر ہے کہ عدمِ محض جس میں ختم اور عدم کا تصوّر اور مفہوم بھی معدوم ہو جائے۔ اپنے اندر ایسے زمانے کا ایسا مفہوم رکھتا ہے، جو ہمیشہ یا دوام کے معنوں کے قریب ہے، ہم لوگ آئے دن ہمیشہ اور دائمی کا لفظ دیر تک اور مستقبل بعید اور بعید تر کے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ یورپ والوں کا ABADON عبرانی کے ABAD سے ماخوذ ہے، جس کا عربی ماخذ "بَدَأ" اور اَبَدْ ہے۔ عبرانی میں اَبَدْ دوزخ کے معنوں میں مجازی طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور ہمارے ہاں اَبَدْ دوزخ کی ایک صنعت ہے جو زمانے کی طوالت اور درازی کے معنوں میں ستعارہ اور مجازی حیثیت میں استعمال ہوئی ہے۔

عبرانی والوں نے عربی کی تقلید میں اَبَدْ دوزخ کے لئے مجازی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ لیکن یورپ والوں نے عبرانی کے تقدس کا احترام کرتے ہوئے اسے حقیقی معنوں سے نواز کر مستقل اپنا لیا ہے۔

بندن ــــــ یورپ کی متعدد زبانوں میں ایک لفظ ABANDON ہے۔ اس کے معنیٰ ہیں چھوڑ دینا، آزاد کر دینا۔ رخصت دینا، ڈھیل دینا وغیرہ فرانسیسی میں ABANDONNER کے شروع میں A نافیہ ہے۔ اور باقی لفظ BANDON وہی ہے جو فارسی میں بندن اور بندیدن مصدر کی صورت میں ملتا ہے۔ اردو اور ہندی والوں نے اس سے باندھنا وضع کیا ہے۔ اور پھر بند اور بندی خانہ اور بندہ اور بندگی وغیرہ قسم کے کلمات تراشے ہیں، گویا اصل کلمہ وہی "بند" ہے جس کے شروع میں اہلِ یورپ نے A نافیہ لگا کر اَبَنْدْ یعنی ABAND بنا لیا ہے۔ اور پھر اسے جرمن زبان میں مصدر کی علامت ON اور فرانسیسی میں مصدر کی علامت ER سے مزین کر کے اپنا لیا ہے۔ بندن یا BANDON کے معنیٰ باندھنے اور قید کرنے قابو میں رکھنے اور غلام بنانے کے ہیں۔ اور A نافیہ لگا کر ABANDON کے معنیٰ آزاد کرنے، چھوڑ دینے اور بے لگام کر دینے کے ہیں۔

اہلِ یورپ کی اپنی تحقیق کے مطابق اس کلمے کا ماخذ ڈچ اور ڈینش زبان کا کلمہ BAN ہے۔ جو

انگریزی میں ممنوع اور ناجائز کے لئے مستعمل ہے، جو واقعی بند اور پابند یا پابندی میں منع اور ممنوع کا مفہوم ہی اصل معنیٰ ہے۔ انگریزی کا ایک اور لفظ BANISH جس کے معنیٰ شہر بدر کرنے کے ہیں اور جو فرانسیسی میں BANNIR قدیم لاطینی میں BANNIRE اور قدیم جرمن زبان میں BANNAN ہے۔ اس کا ماخذ بھی یہی BAN ہے، جو عربی میں بَان، بَوَن اور بَین تینوں صورتوں میں ملتا ہے۔ اور لغت اضداد سے ہونے کے باعث اس کے معنیٰ جہاں الگ کرنے اور چھوڑنے کے ہیں وہ قریب کرنے، پکڑنے اور بند کرنے کے بھی ہیں۔ عربی میں بَنّ کے معنیٰ ہیں بکری وغیرہ کو باندھ کر رکھنا۔

نیز عربی میں "اَبانَ" کے معنیٰ ہیں۔ کاٹنا، جُدا کرنا، وہی جو یورپ والوں نے BAN کے ماخذ کے شروع میں A نافیہ لگاکر ABAN بنایا ہے۔ اور جس کی موجودہ صورت ABANDON وغیرہ کی ہے۔

انگریزی کا کلمہ BAND جماعت بندی، گروہ جو جرمن میں BAND اور فرانسیسی میں BANDE ہے۔ اور BANDAGE جس کے معنیٰ پٹی باندھنے کے ہیں۔ اور اسی طرح BIND اور BOUND اور BOUNDARY وغیرہ سب اسی ماخذ سے لئے گئے ہیں۔ جس سے عربوں نے بکری باندھنے کیلئے بَنّ اور کاٹ کر جدا کرنے کے لئے اَبَانَ بنایا ہے، یعنی بَان، بَوَن اور بَین جو لغت اضداد سے ہے۔ اسپرانتو BANDO (باندو) کے معنیٰ جماعت BANDAĜO (بانداجو) کے معنیٰ ہیں پٹی اور BANDEROLO (باندے رولو) کے معنیٰ ہیں کتابیں یا پارسل وغیرہ باندھنے کا کاغذ۔ یہ سب کلمات بھی عربی کے بَان سے ماخوذ ہیں۔ یاد رہے کہ عربی میں اَبان جس کے معنیٰ کاٹ کر الگ کرنے کے ہیں اس کے شروع میں اَ اہلِ یورپ کی تقلید میں نافیہ نہیں بلکہ متعدی ہونے کی علامت چونکہ "بَان" لغت اضداد سے ہے۔ اس لئے اَبان کے معنیٰ کاٹ کر الگ کرنے اور جوڑ کر ملا لینے کے دونوں طرح درست ہیں۔ اِبَانَۃً مصدر ہے۔

جب کسی کلمہ کی تحقیق کے سلسلہ میں ہم اسپرانتو کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہمارا مقصد یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ کہ جدید زبانوں اور خاص کر یورپ میں رائج زبانوں میں یہ لفظ نسبتاً کسی دوسرے لفظ کے زیادہ مشہور ہے، اس لئے کہ اسپرانتو زبان لاطینی زبان کے ماخذوں کی اساس پر مرتب کی گئی ہے۔ اور اس کے ماخذ یورپ کی بیشتر زبانوں کے مشترک ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ارادہ ــــ ارادہ، قصد اور نشانہ لگانا وغیرہ معنوں کے لئے انگریزی میں AIM (ایم) کا لفظ ہے۔ اس کے ماخذ کی تلاش میں اہلِ یورپ نے بہت کوشش کی اور ہر طرف سے مایوس ہو کر لاطینی زبان کے کلمہ ESTIMARE کو اس (AIM) کا ماخذ قرار دیدیا ہے۔ اور AIM اور ESTIMATE یعنی اندازہ لگانا دونوں کو ہم ماخذ قرار دیا ہے۔ افسوس کہ یہ لوگ عربی کے کلمہ "اَمّ" پر نظر نہ ڈال سکے۔ جو صورتاً اور

معنیٰ دونوں اعتبار سے انگریزی کے AIM کا ماخذ ہے، باقی رہا ESTIMATE جو ESTEEM کی ایک صورت ہے، اس کے شروع میں EST سابقہ ہے۔ جو فارسی کے است یعنی "ہے" کے معنیٰ دیتا ہے۔ اور یورپ میں بہت سی زبانوں میں EST اور ISTUS اور انگریزی میں IS کی صورت میں ملتا ہے۔ اسپرانتو میں ESTI مصدر ہے۔ یعنی ہونا، شدن، اس سابقہ کو حذف کر دیں تو ESTIMATE اور ESTEEM میں IM اور EEM ہی رہ جاتا ہے۔ جو عربی کا "اَمٌّ" ہے۔

نرم ـــــ لاطینی زبان میں ایک لفظ BASSUS ہے جس سے انگریزی کا لفظ BASE ماخوذ ہے۔ اس کے معنیٰ ہیں نرمی۔ نیچے۔ فرانسیسی میں BASE جدید لاطینی میں BASIS اور یونانی میں BASIS نیز انگریزی میں ABASE جس کی ایک صورت ABASING اور ABASEMENT ہے۔ جس کے معنیٰ تذلیل اور نیچا دکھانے کے ہیں یہ سب اسی لاطینی مادے BASSUS سے ماخوذ ہیں جو عربی میں "بسّ"، "بَسَّ" اور "بسوسٌ" کی صورت میں ملتا ہے۔ "بَسَّ" کے معنیٰ ہیں دم دلاسا دیکر اور نرمی کرکے کسی کو خاص کر جانور کو اپنی طرف مائل اور راغب کرنا چونکہ BASE اور اس کے ساتھی کلمات میں پستی عاجزی اور نیچے کا مفہوم قدرِ مشترک کی حیثیت سے پایا جاتا ہے۔ اس لئے مجازی طور پر یہ لفظ بنیاد اور اساس کے معنوں میں بھی مستعمل ہے، جس سے انگریزی کا کلمہ BASIC ماخوذ ہے۔

اہلِ یورپ کی تحقیق کے مطابق ABASE میں A زائد ہے۔ اصل لفظ BSSUS ہے، لیکن بجائے A کو زائد تصور کرنے کے AB کو زائد تصور کریں تو لاطینی میں ASSUS باقی رہ جاتا ہے جو عربی کے کلمہ اُساس اور "اَسَّسَ" کی ہو بہو نقل ہے۔

یورپی زبانوں میں جس طرح اکیلا "A" سابقہ ہے۔ اور اسی طرح "AB" بھی سابقہ ہے دونوں سابقے بھی A اور "AB" نفی کے معنیٰ بھی دیتے ہیں۔ ABARTICULATION انگریزی لغت کا ایک کلمہ ہے، جس کے معنیٰ ہیں گرہ، جوڑ، گانٹھ، ایسی گانٹھ یا جوڑ جو پکا ہو، ہل نہ سکے۔ اہلِ یورپ کی تحقیق کے مطابق اسی لفظ میں AB سابقہ ہے، جو اصل مادے پر زائد کیا گیا ہے۔ اصل کلمہ لاطینی میں ARTICULUS ہے جو انگریزی ARTICULATE اس کے معنیٰ وہی جوڑ اور گرہ یا گانٹھ کے ہیں۔ اس ARTICULUS اور ARTICULATE میں A کے بعد RTIC صاف عربی ماخذ یعنی "رَتقٌ" نظر آرہا ہے جس کے معنیٰ جوڑ، گرہ اور باندھنے یا جوڑنے کے ہیں۔ عربی لغت میں "رَتقٌ" کو "فَتقٌ" کی ضد اور مقابل ٹھہرایا گیا ہے پہلے کے معنیٰ ہیں بند کرنا اور دوسرے کے معنیٰ ہیں چیرنا، کاٹنا الگ الگ کرنا اردو اور فارسی مرکب بست وکشاد عربی میں "رَتقٌ فتقٌ" ہے۔ "الفاتق الراتق" کے معنیٰ

ہیں کھولنے اور باندھنے والا یعنی صاحب اختیار، حکمران، سردار اور سربراہ مملکت وغیرہ۔ بات اپنی حدود سے تجاوز کر گئی ہے۔ مختصر یہ کہ ہمارے زیر بحث کلمہ ABASE کا ماخذ لاطینی میں BASSUS ہے۔ اوّل الذکر میں AB اور مؤخر الذکر میں A زائد ہے، اصل کلمہ ASE یا ASSUS ہے جو عربی میں اساس اَسَّس اور اَسّ کی صورت میں موجود ہے۔ اور دوسرا کلمہ جو دوران گفتگو زیر بحث آگیا ہے ABARTICULATION ہے جس کے شروع میں AB سابقہ اور اس کے بعد والا A زائد ہے، باقی RTIC وہی عربی کا "رتق" ہے۔ کلمہ کے آخر LATION کے لاحقہ ہونے میں تو کسی کو کلام کی گنجائش ہی نہیں۔

شرمندگی —— A نافیہ کی ایک اور مثال یورپ والوں کے کلمہ ABASH میں ملتی ہے۔ انگریزی میں ABASH کے معنیٰ ہیں شرمندہ ہونا اور ABASHMENT کا مفہوم ہے۔ شرمندگی اس کا ماخذ BAH ہے جس کے معنیٰ ہیں واہ واہ۔ گویا کلمۂ تحسین ہے۔ عربی میں اسکی صورت بَخّ ہے۔ اور اسی عربی کے بَخّ سے ماخوذ کلمہ BAH کے شروع میں A نافیہ لگا کر تحسین اور پسندیدگی کا الٹ اور ضد یعنی شرمندگی اور ناپسندیدگی کا مفہوم پیدا کر لیا گیا ہے۔

کم کرنا —— ABATE کے معنیٰ ہیں کم کرنا، گھٹانا، فرانسیسی میں یہ لفظ ABATTRE ہے جس کا لاطینی ماخذ BATERE اور BATUERE ہے، گویا انگریزی اور فرانسیسی میں اصل مادے پر A زائد کیا گیا ہے۔ عربی کا کلمہ اُبْتَر بمعنی دم کٹا مشتق ہے۔ بَتَرَ کے معنیٰ دم کٹا ہوا کر دینا۔ کاٹنا۔ کم کرنا، ناتمام کرنا وغیرہ۔ ایک دوسرا لفظ عربی میں بَطِرَ اس کے معنیٰ ہیں دوسرے کو کم سمجھ کر اپنے آپ کو بڑا خیال کرنا، تکبر وہی جس میں دوسرے کی حقارت اور تخفیف ہوتی ہے۔

ر = ل —— ہماری سابقہ معروضات میں یہ بات آچکی ہے کہ زبانوں میں جو اول بدل اور تبدیلی ہوتی ہے، اس کے مطابق "ر" اور "ل" یا R اور L ایک دوسرے سے بدل جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ "بتر" (ب ت ر) کے معنیٰ ہیں کاٹنا۔ اس میں "ر" کو "ل" سے بدل دیا جائے تو "بتل" بن جائے گا۔ اور اس کا مفہوم بھی وہی کم کرنا اور کاٹنا ہے۔ دوسری طرف بطر (ب۔ ط۔ ر) کے معنیٰ ہیں۔ تکبر اور بڑائی ظاہر کرنا تو "ر" کو "ل" سے بدل دیں تو "بطل" کی صورت حاصل ہوتی ہے، جو بہادری کے معنیٰ کی حامل ہے۔

اختصار —— اختصار عربی لفظ ہے۔ اہل یورپ کے ہاں ایک لفظ ABBREVIATE ہے۔ جس کے معنیٰ اختصار اور کمی کے ہیں۔ اس کے شروع میں AB زائد تسلیم کیا گیا ہے۔ گویا اصل کلمہ BREVIATE ہے۔ یورپ کی مختلف زبانوں میں B، V، اور F ہم آواز حروف ہیں۔ اس طرح

BREV نے BRIEF کی صورت اختیار کر لی گویا BRIEF جو عام جانا پہچانا انگریزی کا کلمہ ہے۔ اور جس کے معنیٰ "مختصر" کے ہیں۔ اس میں F (ف) اصل حرف نہیں بلکہ کسی دوسرے حرف کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ اہلِ یورپ کی تحقیق کے مطابق ABBREVIATE اور BRIEF کا ماخذ BRIDGE ہے۔ غالباً BRIDGE (پُل) اور BRIEF (مختصر) میں وجہ اشتراک یہ ہے کہ BRIDGE (پُل) راستے کو مختصر کر دیتا ہے۔ اگر دریا، نالے وغیرہ پر پُل نہ ہو تو ظاہر ہے۔ مسافر کو دور دراز کا چکر کاٹ کر پار جانا پڑے گا۔

بہر حال BRIEF اور BRIDGE میں وجہ اشتراک کچھ بھی ہو اہلِ یورپ نے دونوں کو ہم ماخذ قرار دیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ BRIDGE (پل) جس کا تلفظ "برج" (BRIJ) اور جو قدیم انگریزی میں BRIG ڈینش (ڈنمارک کی زبان) میں BRYGGE جرمن میں BRÜCKE اور ہالینڈ والوں کی زبان ڈچ میں BRUG ہے۔ اس کا عربی ماخذ "بُرج" ہے۔ جو پلوں کے آر پار پُلوں کی حفاظت اور مسافروں کی چیکنگ (تفتیش) کے لئے آج بھی نظر آرہے ہیں۔

دور دراز ـــــ ایک لفظ ABROAD ہے اس کے معنیٰ ہیں دور دراز، غیر ملک، پردیس وغیرہ۔ اس لفظ کے شروع میں A زائد ہے۔ اصل لفظ BROAD جس کے معنیٰ ہیں کشادہ، چوڑا، وسیع، صاف، انیگلو سا کسن میں یہ لفظ BRAD ہے۔ ڈچ میں BREED اور ڈینش میں BRED نیز جرمن میں BREIT ہے۔ ریڈیو اسٹیشن سے کسی پروگرام کے نشر کئے جانے کو BROADCAST کہتے ہیں۔ یہ لفظ BROAD اور CAST سے مرکب ہے۔ CAST کہتے ہیں کھیت میں بیج بکھیرنے کو اور مرکب کے معنیٰ ہوئے دور دراز تک بکھیرنا۔ یعنی نشر کرنا۔ اہلِ یورپ نے نہایت سادگی سے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ کہ انہیں BROAD کے ماخذ کا علم نہیں۔

عربی میں بَرَد، ابراد، بردد اور برید کے کلمات ملتے ہیں یہ سب بَرَد سے ماخوذ اور مشتق ہیں، برید قاصد اور فاصلے ہر دو کے لئے مستعمل ہے۔ کچھ لوگوں نے برید ڈاک یا قاصد کو فارسی کے مصدر بریدن (کاٹنا) سے ماخوذ قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ڈاک لے جانے والے گھوڑوں کے دم کاٹ دئے جاتے تھے۔ اس لئے برید جو اصل میں دم بریدہ ہے، ڈاک لے جانے والے گھوڑے اور مجازاً ڈاک یا قاصد کے لئے استعمال کیا جانے لگا ہے۔ امر واقع یہ ہے کہ ڈاک کے گھوڑوں کی دم کاٹنے کا رواج عہدِ رسالت کے بہت بعد کا واقعہ ہے۔ اور برید بمعنی قاصد اور فاصلہ حدیث میں مذکور ہے۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ بُرد سے ماخوذ بُرید اور برود عربی میں قاصد اور فاصلے کے معنوں میں آیا

ہے۔ اِبْرَاد کے معنیٰ ہیں قاصد بھیجنا اور ظاہر ہے، قاصد دور، فاصلے اور غیر ملک یا علاقے میں بھیجا جاتا ہے۔ اور اسی نسبت سے اہلِ یورپ نے BROAD اور ABROAD وغیرہ کلمات سے بعد مسافت، فاصلہ، وسعت اور غیر ملک مراد لیا ہے۔

راستہ ـــ انگریزی میں ROAD جو BROAD کا ایک حصّہ ہے، سڑک اور راستہ کے معنیٰ دیتا ہے۔ فرانسیسی میں ROUTE کے معنیٰ راستہ اور سڑک کے ہیں، انگریزی میں بھی فرانسیسی کا لفظ ROUT راستے ہی کے معنیٰ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ROOT انگریزی میں جڑ، راستہ اور تلاش اور خاص کر خوراک کی تلاش کے معنوں میں مستعمل ہے۔ اسی طرح ROUTINE یعنی طور، طریقہ، دستور بھی انگریزی کا کلمہ فرانسیسی کے ROUTE ہی کا ہم ماخذ ہے۔ فارسی میں پانی کے راستے کو "رود" کہتے ہیں۔ "رودخانہ" کے معنیٰ ہیں۔ دریا ROUT ہسپانوی میں RUTA اور پرتگالی میں ROTA -

ROAD اور ROUT سے ظاہر ہے کہ D (د) اور T (ت) ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں۔ اور اسکی اور بیشمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن میں D - T اور TH (د۔ت۔تھ) ایک دوسرے کی جگہ آتے ہیں۔

اہلِ یورپ نے ان کلمات کے ماخذ کی تلاش میں RIDE یعنی سوار ہونا اور پھر RAID یعنی حملہ کرنا، جو عام طور پر سوار ہو کر کیا جاتا ہے، ان سب کو ایک دوسرے سے وابستہ قرار دیا ہے۔ لیکن کسی ایک کو ماخذ اور ROOT قرار نہیں دے سکے۔ ہمارا خیال ہے کہ عربی کا کلمہ رَوْد جس کے معنیٰ تلاش اور آمد و رفت کے ہیں۔ ان تمام کلمات کا ماخذ ہے عربی انگریزی لغت میں رَادَ، رودًا و رِیَادًا کے معنیٰ ہیں TO SEARCH FOR FOOD (خوراک تلاش کرنا) اور یہی معنیٰ ROOT کے ذیل میں انگریزی لغت میں درج ہیں ـــ اور اہلِ یورپ کا یہ خیال کہ حملہ گھوڑے پر سوار ہو کر کیا جاتا تھا، اس لئے RAID کا ماخذ RIDE ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خواہ مخواہ دور کی کوڑی لانے کی کوشش ہے۔ ورنہ یہ بات زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ کہ یورپ کے وحشی قبائل ROOT یعنی خوراک کی تلاش میں RAID یعنی حملہ کیا کرتے تھے، اور یہ ثانوی بات ہے کہ حملہ اکثر سوار ہو کر کیا کرتے تھے۔ ویسے سواری کے دونوں جانور یعنی گھوڑا اور اونٹ عرب سے یورپ گئے ہیں۔ اور جس زمانے میں یورپ کا وحشی بندر نما انسان خوراک کی تلاش میں مارا مارا پھرا کرتا تھا، اور اپنے ہم جنس اور بھائیوں پر حملے کیا کرتا تھا۔ اس زمانے میں سواری کے جانور اہلِ یورپ کی دسترس میں نہ تھے۔ بات یوں ہے کہ جن عربوں نے راد اور "رود" کے کلمات یورپ کو ROAD - ROUT - ROOT اور RAID کی صورت میں دئے ہیں انہی عربوں نے RIDE (سوار ہونے) کیلئے انہیں اونٹ اور گھوڑے مہیا کئے ہیں۔

ایبٹ ـــــ ABBOT (ایبٹ) انگریزی میں صدر راہب کے معنوں میں مستعمل ہے اسکی تانیث ABBESS یہ لفظ یورپ میں ABBATIS - ABBAS - ABBAT اور ABBA کی صورت میں ملتا ہے۔ ABBEY خانقاہ کے لئے مستعمل ہے جہاں راہب لوگ رہتے ہیں۔ یورپ والوں نے یہ اور اس کے ساتھی کلمات لاطینی سے لئے ہیں۔ اور لاطینی میں عبرانی کے "ابوت" سے ماخوذ ہیں۔ عبرانی زبان میں عربی کا لفظ "اَبؐ" والد، باپ، بزرگ، امام، مذہبی پیشوا، مالک، بادشاہ اور خدا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

اَبؐ عبرانی میں مذکر ہے اور عام قاعدے کے مطابق اسکی جمع "ابیم" آنی چاہیئے تھی، لیکن یہ لفظ (اَبؐ) ان خاص کلمات میں سے ایک ہے، جو مذکر ہونے کے باوجود جمع کی صورت میں ان کے آخر "وت" جو جمع مؤنث کی علامت ہے، استعمال ہوتی ہے۔ گویا عربی کا لفظ اَبؐ۔ عبرانی میں جاکر جمع کی صورت میں مؤنث بن گیا ہے۔ اس طرح عبرانی کے "ابوت" کے عربی معنیٰ ہیں "آباء" عبرانی میں واحد کے لئے احتراماً جمع کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے، یعنی "اَبؐ" (باپ) کا احترام یہ ہے کہ اسے جمع "ابوت" استعمال کیا جائے اور یہی "ابوت" یورپ کے ہاں ABBOT ہے، جو تحریر "اَبوّٹ" اور تلفظ میں "ایبٹ" یا "ایبت" ہے۔

یوں تو عبرانی میں عربی کی طرح اَبؐ (باپ) کی تانیث "اُمّ" (ماں) آتی ہے۔ لیکن جب "اَبؐ" بمعنی والد نہیں بلکہ صدر، پیشوا یا بادشاہ کے ہوں تو پھر اسکی تانیث "اُمّ" نہیں آتی، یہی وجہ ہے، کہ اہل یورپ نے ABBOT کی مؤنث ABBESS بنائی ہے۔ ESS یورپ کی زبانوں میں لاحقہ ہے جو مذکر کے آخر آکر لفظ کو مؤنث بنا دیتا ہے۔ جیسے MISTRESS اور GODDESS کے آخر ESS تانیث کے لئے ہے۔ مختصر یہ کہ اہل یورپ نے عبرانی کے "اَبؐ" اور "ابوت" سے ABBOT تو لے لیا ہے، لیکن اسکی تانیث اپنے قاعدے کے مطابق ESS لگاکر بنائی ہے ـــــ یاد رہے کہ یورپ کے یہودی اور عیسائی باپ بیٹا اور ماں یا بیٹی کے کلمات صرف خونی رشتہ کے لئے ہیں۔ بلکہ روحانی رشتوں کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں۔ وہ خدا کو باپ اور اسکے نیک بندوں کو بیٹے اور بیٹیاں کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ گویا عربی میں اَبؐ اور رَبؐ دو کلمے ہیں اور عبرانی والے "اَبؐ" ہی سے "رَبؐ" کا مفہوم بھی لیتے ہیں ـــــ ہمارے ہاں بھی رَب خدا کے علاوہ دوسرے معنوں میں بھی آتا ہے۔ مگر اضافت کیساتھ مطلق رَبؐ تو خدا ہی ہے۔ البتہ رَبؐ البیت یا ارباب حکومت و سیاست وغیرہ میں رَبؐ خدا کے معنوں میں نہیں۔ مسلمان توحید میں احتیاط کو ملحوظ رکھ کر خدا کو احتراماً بھی جمع کے صیغے سے مخاطب نہیں کرتے نیز خدا کو باپ یا اس کے بندوں کو بیٹے وغیرہ کے کلمات سے پکارنا اسلام کے لسانی مزاج کے خلاف ہے۔

ہمارے اسلاف

حافظ محمد اکبر شاہ بخاری
ناظم جمعیت علماء اسلام۔ جام پور

ہندوستان میں قصبہ دیوبند یوپی کے مغربی ضلع سہارنپور میں بجانب دلّی ریلوے لائن پہ واقع ہے۔ سہارنپور سے بیس میل بجانب جنوب ہے۔ یہاں شرفاء اور دیندار لوگوں کی آبادی تھی، آبادی کا بیشتر حصہ عثمانی، صدیقی، فاروقی شیوخ کی اولاد پہ مشتمل تھا۔ بڑے بڑے علماء اولیاء اور مجاہدین اس سرزمین پاک میں پیدا ہوئے، جنہوں نے اسی مقام پہ ایک عظیم دینی درس گاہ کی بنیاد ڈالی جو عالم اسلام میں آج دارالعلوم دیوبند کے نام سے مشہور ہے۔ مورخہ ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء کو اس عظیم درس گاہ کا افتتاح ہوا، اور اللہ کے کچھ مخلص بندوں نے ایک چھوٹی سی مسجد میں جسے چھتہ مسجد کہتے تھے، ایک انار کے درخت کے نیچے آب حیات کا یہ چشمہ جاری کر دیا۔ بالآخر دنیا نے دیکھ لیا ہے کہ اسی سادہ سی درسگاہ سے علم و فضل کے ایسے آفتاب و ماہتاب پیدا ہوئے جنہوں نے ایک دنیا کو جگمگا کر رکھ دیا اور اللہ تعالیٰ نے دارالعلوم دیوبند کو جو فضیلت اور جو امتیاز بخشا بہت ہی کم علمی اداروں کے حصے میں آتا ہے۔ چنانچہ دارالعلوم سے پیدا ہونے والی بے مثال شخصیتیں جن سے دنیا میں علم و عرفان کے چشمے جاری ہوئے اس کثرت سے ہیں کہ شمار میں لانا مشکل ہے۔ ان حضرات کے خصائص کی تفصیل کے لئے مستقل فرصت اور ایک پورا دفتر درکار ہے۔ مختصر یہ کہ ان حضرات کے جمیع اوصاف و کمالات کا احاطہ بہت مشکل ہے۔

یہ حضرات علوم کتاب و سنّت، علوم ظاہر و باطن کے جامع اور عارفین اور اصحاب قلوب کی وراثت کے امین تھے، انہوں نے پہاڑ سے زیادہ راسخ عزائم کے ساتھ ورع و زہد، انکسار و تواضع اور اتباع سنّت ایسے بلند پایہ اخلاق و شمائل کو اس حد تک جمع کر لیا تھا کہ اخلاق عالیہ میں یہ حضرات اپنے دور میں ضرب المثل تھے ان کے سینے علوم نبویہ سے معمور اور ان کے دل معرفت الٰہیہ، حب الٰہی اور حب نبوی ﷺ سے منور تھے۔ الغرض یہاں کا فیض یافتہ ہر شخص اپنی ذات میں ایک انجمن ہے۔ بقول مفتی اعظم

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی مدظلہ العالی۔ دار العلوم دیوبند درحقیقت ان ہی عظیم شخصیتوں اور اسی طرزِ فکر کا نام ہے ۔ بہرحال اسی مدرسۂ فکر سے ایسے ایسے علماء واکابر، مجاہدین، محدثین اور فقہاء امت پیدا ہوئے کہ جن کی مثال سے دنیا خالی ہے ۔ انہی مقدس اور عظیم ہستیوں میں سے قطب الہند، امام الفقہاء مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی قدس سرہٗ کی ذات گرامی تھی، جن کا فیض عرب وعجم میں پھیلا ہوا ہے ۔ اس عظیم شخصیت کا مختصراً تذکرہ پیش کیا جاتا ہے ۔

نسب وولادت آپ دیوبند کے عثمانی شیوخ کے چشم وچراغ تھے، شجرۂ نسب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے، آپ کے والدِ محترم حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانیؒ اپنے زمانہ کے عالم وفاضل، اردو ادب کے ماہر اور ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ آپ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ کے قریبی احباب میں سے اور دار العلوم دیوبند کے بانیین میں سے ہیں۔ آپ کے دوسرے بھائیوں میں فخر العلماء حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی، سعید الرحمٰن عثمانی، بابو فضل حق عثمانی اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی ہیں، آپ ان سب بھائیوں میں بڑے تھے ۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ سوانح قاسمی مصنفہ مولانا مناظر احسن گیلانی کے حواشی میں تحریر فرماتے ہیں : " مولانا فضل الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ کی براہِ راست اولاد میں حضرت اقدس مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اپنے اپنے وقت میں علم ودین کے افق پر آفتاب وماہتاب بن کر چمکے ۔" (تجلیاتِ عثمانی)

بلاشبہ حضرت قاری صاحب مدظلہم کے قول کے مطابق یہ تینوں حضرات علم ودین کے اُفق پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے ۔ یہ حضرات جن پر دار العلوم کو ہمیشہ فخر رہے گا ۔ دین کے دراصل امام تھے ۔

۱۸۵۸ء حضرت امام الفقہاء ۱۲۷۵ھ میں اسی قصبہ دیوبند میں پیدا ہوئے ۔ اصل نام عزیز الرحمٰن ۱ھ تاریخی نام ظفر الدین ہے ۔ زمانۂ طفولیت سے ہی ذہانت ومتانت، فراست وشرافت اور صداقت کے مجسم پیکر تھے ۔

تعلیم وتربیت ۱۸ء آپ کی تعلیم وتربیت اکابرین دیوبند کی آغوش میں ہوئی ۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ سے بیشتر کتابیں پڑھیں ۔ ۱۲۹۸ھ میں تمام علوم وفنون سے فارغ التحصیل ہوئے اور جن حضرات کے ساتھ دار العلوم دیوبند میں دستار بندی ہوئی اُن میں مولانا احمد سکندر پوری، مولوی محمد اسحاق فرخ آبادی، مولوی منفعت علی صاحب دیوبندی، مفتی رحیم بخش شیر کوٹی اور مولوی سراج الحق صاحب دیوبندی شامل ہیں ۔

درس و تدریس | ۱۲۹۹ھ میں حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ اور مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ، دارالعلوم دیوبند میں بلا تنخواہ مدرس مقرر ہوئے، اس کے بعد آپ بسلسلۂ تعلیم و تدریس مدرسہ عالیہ رام پور تشریف لے گئے اور ۱۳۰۹ھ تک آپ وہاں بمشاہرہ دس روپیہ ماہوار پر تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اور وہاں کافی حضرات آپ کے ظاہری و باطنی فیوض سے مستفیض ہوتے رہے۔ ۱۳۰۹ھ میں دارالعلوم کی طلب پر آپ دوبارہ دیوبند تشریف لائے تو نیابت اہتمام کا منصب آپ کے سپرد کر دیا گیا۔

خدمتِ افتاء | دارالعلوم دیوبند کی شہرت اور مقبولیت عام تھی اس وجہ سے دور دراز کے مقامات سے استفتاء بکثرت آتے تھے اور مدرسان دارالعلوم کو کارِ تعلیم سے اس قدر فرصت نہیں ہوتی تھی کہ بلاحرج تعلیم اُن کے جوابات لکھ سکیں اور دارالعلوم جس مقصد کے تحت قائم کیا گیا تھا اسکی بناء پر اس کے فرائض میں یہ بات بھی داخل تھی کہ بعنوان افتاء بھی عوام کی خدمت کی جائے گی۔ ابتدائی سالوں میں اساتذہ دارالعلوم بالخصوص عارف باللہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہٗ حسبِ ضرورت و موقع فتاویٰ تحریر کرتے رہے۔ لیکن کام کی ذمہ دارانہ نوعیت و اہمیت نے اس بات پر مجبور کر دیا کہ کسی صاحبِ شخصیت کو باقاعدہ مفتی نامزد کر کے دارالافتاء کو مستقل حیثیت میں قائم کیا جائے لہذا ۱۳۱۰ھ میں حضرت گنگوہیؒ نے حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کو اس عظیم منصب اور اہم ذمہ داری کے لئے منتخب فرمایا، پھر اس وقت سے ۱۳۴۶ھ یعنی ۳۶ سال تک بدستور بحیثیت صدر مفتی دارالعلوم دیوبند بلکہ مفتی اعظم ہندوستان خدمتِ افتاء سرانجام دیتے رہے اور فتاویٰ صادر فرماتے رہے۔ چنانچہ محدثِ کبیر حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری فرماتے ہیں: "علماء دیوبند میں سے صرف ایک عالم مولانا الشیخ الفقیہ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندی نے مختلف سوالات کے جواب میں پچاس ہزار فتاویٰ صادر فرمائے۔"
(دارالعلوم دیوبند نمبر ص ۱۵۳)

مولانا محمد اسلام بہاری دارالافتاء دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں کہ: "دارالعلوم دیوبند میں دارالافتاء کے قیام کے بعد اس بین الاقوامی علمی مرکز دارالافتاء کے لئے ایسی شخصیت کی تلاش تھی جو علم و تفقہ کی امتیازی استعداد کے ساتھ صلاح و تقویٰ اور برگزیدگی کی شان کی حامل ہو۔ چنانچہ ایک ایسی شخصیت کا انتخاب عمل میں آیا جو گویا ازل سے اس عہدے کے لئے پیدا کی گئی تھی، وہ ذات گرامی تھی مفتی اعظم عارف باللہ حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی دیوبندی قدس سرہٗ کی، وہ ۱۳۱۰ھ سے ۱۳۴۶ھ تک عہدہ افتاء پر فائز رہے گویا ۳۶ سال تک افتاء کی خدمت انجام دیتے رہے لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ۱۸ سال تک افتاء کی نقل نویسی نہ ہوئی اس وجہ سے اس وقت کی نقل موجود نہیں۔ ۱۳۲۹ھ سے طلباء نے نقل شروع کی۔

۱۳۳۳ھ میں مولانا قاضی مسعود احمد صاحبؒ کا تقرر آپ کے رفیقِ سفر کی حیثیت سے ہوا، اس وقت سے رجسٹر میں مستفتی کے سوالات اور ان کے جوابات کی نقل موجود ہے، جن کی مجموعی تعداد ۳۸ ہزار کے قریب ہے۔ یہ تعداد درج رجسٹر کی ہے۔

علاوہ بریں کچھ ایسے حضرات بھی ہوں گے جن کے فتاویٰ عجلت کی وجہ سے رجسٹر میں درج نہ ہوئے ہوں، نیز ایک مستفتی کئی کئی سوالات ایک کاغذ میں لکھتے ہیں۔ اگر اوسطاً تین سوالات مان لئے جائیں تو فتاویٰ کی مجموعی تعداد تقریباً سوا لاکھ ہوتی ہے، اور یہ تعداد بھی ان فتاویٰ کی ہے جو رجسٹر میں درج ہوئے اس سے پہلے کی جب کہ نقل افتار کا انتظام نہیں تھا، اتنی ہی تعداد فرض کر لی جائے تو اس طرح حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کے فتوے کم وبیش ڈھائی لاکھ ہوتے ہیں۔ (ماہنامہ "الرشید" لاہور کا دارالعلوم دیوبند نمبر)

ان فتاویٰ کا یہ بے نظیر مجموعہ اور مسائل فقہیہ کا یہ بے مثال ذخیرہ عام نظروں سے اوجھل تھا اس لئے سب سے پہلے آپ کے علمی جانشین اور شاگردِ رشید حضرت قبلہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہٗ العالی نے آپ کے فتاویٰ بنام "عزیز الفتاویٰ" شائع کئے تھے جو بہت مختصر اور غالباً ایک دو سال کے فتاویٰ کا مجموعہ تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے آپ کے تمام فتاویٰ کو جدید ترتیب سے شائع کرنے کا پروگرام بنایا۔ اور اس کام کے لئے مولانا ظفر الدین صاحب کو مامور کیا، انہوں نے غیر معمولی جانفشانی اور تندہی سے ترتیب فتاویٰ کا کام حسنِ اسلوب سے انجام دیا جن کی نو جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور ابھی کام جاری ہے۔ الغرض آپ کی علمی اور فقہی خدمات بہت ہیں جن کا احاطہ مشکل ہے۔ آپ کو فنِ افتار میں اس قدر مہارت تھی کہ مشکل ترین معاملات پر بھی برجستہ فتاویٰ تحریر فرما دیتے تھے۔

آپکا علمی مقام | حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ کا علمی و روحانی مقام بہت بلند ہے۔ بڑے بڑے علمار و مشائخ نے آپ کی جامع شخصیت کا اور آپ کے علمی مقام کا اعتراف کیا ہے۔ حضرت حکیم الامت مجدد ملت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ جنہیں آج دنیا اسی صدی کے عظیم مذہبی و روحانی پیشوا کی حیثیت سے جانتی ہے۔ اور جنہوں نے تقریباً بارہ سو سے زائد تصانیف ورثے میں چھوڑی ہیں اور جن کا ہر خلیفۂ مجاز ایک آفتاب اور ماہتاب بن کر چمکا ہے۔ وہ بھی حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کے فتاویٰ پر مکمل اعتماد کرتے تھے۔

قطب الارشاد حضرت گنگوہی قدس سرہٗ بھی آپ کی علمی شان کے معترف تھے اسی لئے آپکی

نظرِ انتخاب بعہدہ صدر مفتی دارالافتاء دارالعلوم دیوبند حضرت مفتی صاحب پر ہی پڑی۔ چنانچہ مولانا قاری محمد عبداللہ سلیم صاحب لکھتے ہیں کہ: "سن ۱۳۱۰ھ میں قطب العالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ نے مجلس شوریٰ میں یہ تجویز پیش کی اور مجلس کی منظوری کے بعد جس جلیل القدر منصب کے لئے جس کو نامزد کیا گیا وہ عظیم المرتبت شخصیت فقیہہ الامت عالی مقام صوفی، ذی مرتبت عالم، باکرامت بزرگ حضرت مفتیٔ اعظم مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی قدس سرہٗ کی تھی۔ اور آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ اسی منصب کے لئے موزوں تھے بلکہ اسی کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ (دارالعلوم دیوبند نمبر)

امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں: "کہ اب سے ایک صدی پہلے تک اس شان کا فقیہہ النفس علماء کی جماعت میں نظر نہیں آتا۔ (مقدمہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند نمبر)

مؤلف تذکرہ مشائخ دیوبند لکھتے ہیں کہ مشائخ دیوبند میں حضرت امام ربانی مولانا گنگوہیؒ فقیہہ النفس تھے۔ یا حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ فقیہہ النفس تھے۔ (تذکرہ مشائخ دیوبند)

شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: "جس وقت میں کنز الدقائق کے حاشیہ سے فارغ ہوا تو مسودہ بغرض اصلاح حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت مفتی صاحب نے تمام حاشیہ کو نشان لگا کر رنگین کر دیا اور فرمایا کہ اس جگہ فلاں کتاب کے فلاں صفحہ کی فلاں عبارت درج ہونی چاہیئے۔ بلاشبہ حضرت مفتی صاحب کی رگ رگ میں فقہ رچا ہوا تھا۔ اگر وہ زمانہ سابق میں ہوتے تو فقہ میں صاحب مسلک ہوتے لیکن باوجود فقیہہ النفس ہونے کے امام اعظم کی تقلید کا قلادہ گردن میں ڈالے ہوئے تھے، اور اس پر فخر کیا کرتے تھے۔ (تذکرہ مشائخ دیوبند)

ممتاز تلامذہ آپ کے علمی و روحانی مقام کا اسی طرح بھی پتہ چلتا ہے۔ کہ آپ کے تلامذہ میں ایسے ایسے مشاہیر پیدا ہوئے ہیں کہ جن کا نام آتے ہی گردنیں احترام سے جھک جاتی ہیں۔ اور بقول جناب پروفیسر انوار الحسن صاحب شیر کوٹی کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ (انوار قاسمی) آپ کے تلامذہ میں بڑے بڑے نامور فاضل، مفسر، محدث، مدبر، مفکر، فقیہہ، مجاہد، مصنف، صوفی، درویش، ادیب، شاعر، منطقی، فلسفی، مفتی اور معلم پیدا ہوئے جن میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ جن میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ جن میں مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، شیخ الحدیث صاحب مولانا محمد ادریس

کاندھلویؒ، مولانا بدر عالم میرٹھیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور مولانا محمد یوسف بنوری شامل ہیں۔

غرضیکہ حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کے علمی و عملی مقام اور فقیہہ النفس ہونے میں کسی قسم کا کلام یا شبہ نہیں ہے۔ آپ واقعی اِس دور کے امام الفقہاء تھے، اور دارالعلوم دیوبند کے جلیل القدر اکابر میں سے تھے۔۔۔۔

سلوک و تصوف | حضرت مفتی صاحب کو علومِ ظاہری پر جس طرح درک تھا، اسی طرح روحانیت و تصوّف اور اخلاقِ باطنی میں بھی بلند مقام حاصل تھا۔ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحبؒ مہتمم اول دارالعلوم دیوبند سے بیعت و خلافت حاصل تھی۔ کرامات و تصرفات کے بہت سے واقعات آپ کی طرف منسوب ہیں۔ جن کے جاننے اور دیکھنے والے آج بھی بحمد للہ پاک و ہند میں موجود ہیں۔ مولانا شاہ رفیع الدین صاحب قدس سرہٗ پر چونکہ نقشبندیت کا غلبہ تھا۔ اس وجہ سے آپ کے مریدین خصوصاً حضرت مفتی صاحب پر بھی نقشبندیت کا غلبہ تھا۔ آپ کے خلفاء اور مریدین کا حلقہ وسیع ہے۔ خاص طور پر مولانا قاری محمد اسحاق صاحب میرٹھیؒ بہت معروف تھے۔ جن کے خلیفۂ مجاز حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنیؒ ہیں۔

تواضع وانکساری | آپ کے مزاج میں بے حد سادگی تھی، تواضع وانکساری، زہد وتقویٰ میں آپکو کمال حاصل تھا، تواضع اِس قدر کہ باوجود تلامذہ اور خدام کی موجودگی کے اپنے گھر کا کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ اپنا اور پڑوسیوں کا سامان بازار سے خرید کر دامن میں لایا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ حضرت علیؓ کا یہی طرزِ عمل تھا۔ چنانچہ مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ: "حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ کے علم وفضل کا یہ عالم تھا کہ آج اُن کی تصنیف "عزیز الفتاویٰ" عہدِ حاضر کے تمام مفتیوں کے لئے مآخذ بنی ہوئی ہے۔ اور فتویٰ کے ساتھ شغف کا یہ حال تھا کہ وفات کے وقت بھی ایک استفتاء ہاتھ میں تھا جسے موت ہی نے ہاتھ سے چھڑا کر سینے پر ڈال دیا تھا۔ لیکن سادگی تواضع اور خدمتِ خلق کا یہ مقام تھا کہ یہ کوئی کیسے سمجھے کہ یہ بھی کوئی بڑے عالم یا صاحبِ کرامت صوفی اور صاحبِ نسبت شیخ ہیں جب کہ غایتِ تواضع کا یہ عالم ہو کہ بازار سے سودا سلف نہ صرف اپنے گھر کا بلکہ محلے کی بیواؤں اور ضرورت مندوں کا خود لاتے۔ بوجھ زیادہ ہو جاتا تو بغل میں گٹھری دبا لیتے اور پھر ہر ایک کے گھر کا سودا مع حساب کے اس کے گھر پہنچاتے تھے، کبھی تو اسی سودا سلف لانے میں ایسا بھی ہوتا کہ جب آپ کسی عورت کو سودا دینے کے لئے جاتے تو وہ دیکھ کر کہتی: "مولوی صاحب! یہ تو آپ غلط لے آئے ہیں

میں نے تو یہ چیز اتنی نہیں، اتنی منگائی تھی۔ چنانچہ یہ فرشتہ صفت انسان دوبارہ بازار جاتا اور اس عورت کی شکایت دور کرتا۔ (مقدمہ فتاویٰ دار العلوم دیوبند)

زہد و تقویٰ اس قدر کہ باوجود تبحر علمی اور فقیہہ النفس ہونے کے نماز و وضو کے مسائل کتاب دیکھ کر بتلاتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ "یہ طریقہ اس وجہ سے اختیار کئے ہوئے ہوں کہ ممکن ہے کبھی مجھ سے سہو ہو جائے اور مسئلہ دھوکے میں غلط بتا دوں، لیکن کتاب دیکھ کر بتانے میں ذمہ داری میرے اوپر سے اٹھ جاتی ہے۔ اور کتاب والے پر یہ ذمہ داری آجاتی ہے۔ (بحوالہ تذکرہ مشائخ دیوبند)

اسی طرح ظاہری و باطنی شکوک و شبہات میں آپ ہمیشہ حضرت گنگوہیؒ کیطرف رجوع کرتے تھے۔ اور آپ کے قول کو قولِ فیصل جانتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ کو "لیس الانسان الا ما سعیٰ" آیت کے متعلق ایک شبہ ہوا کہ جب انسان کو اسکی سعی کا اجر ملتا ہے تو ایصالِ ثواب بعد مرنے کے دوسروں کی سعی ہے یہ کیوں مردے کو پہنچتا ہے، تمام دن اسی کش مکش میں گزر گیا، رات ہو گئی مگر اشکال رفع نہ ہوا، دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر آج کی رات انتقال ہو گیا تو قرآن کی ایک آیت کے متعلق دل میں ایک شک سے کر جاؤں گا۔ بس پھر کیا تھا رات ہی کو پیادہ پا عازمِ گنگوہ ہوئے صبح ہوتے ہی آستانۂ رشیدیہ پر موجود تھے۔ اس وقت حضرت گنگوہی قدس سرہٗ وضو فرما رہے تھے، پوچھا کون صاحب! حضرت مفتی صاحبؒ نے عرض کیا: "عزیز الرحمٰن" اس کے بعد اپنا اشکال پیش کیا تو حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ "یہاں سعی سے مراد سعی ایمانی ہے۔" یعنی کسی کا ایمان کسی کے کام نہ آئے گا باقی ایصالِ ثواب ایک دوسرے کے ضرور کام آئیں گے۔ (رسالہ دار العلوم۔ جولائی ۱۹۵۸ء)

اس واقعہ سے حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کے بہت سے کمالاتِ باطنیہ کی طرف بھی ارشاد ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ اسی طرح گنج مراد آبادی بھی حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مولانا موصوف قدس سرہٗ نے آپکو بہت زیادہ عنایات سے نوازا تھا۔ بہر حال حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ اپنے ظاہری و باطنی علمی و روحانی کمالات میں اپنی نظیر آپ تھے۔

وفات ۱۳۴۶ھ میں آپ مستعفی ہو کر ڈابھیل تشریف لے گئے اور وہاں کچھ دن قیام فرما کر واپس دیوبند تشریف لے آئے اور تھوڑے عرصہ بعد ۱۷ جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ کو آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور قبرستان قاسمی میں آپ کو سپردِ خاک کیا گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

آپ کی اولاد میں حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رکن مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند اور مولانا قاری جلیل الرحمٰن صاحب استاذ تجوید دار العلوم دیوبند قابلِ فخر فرزند ہیں۔ اس دور کے جید علماء میں شمار ہیں۔

پروفیسر محمد سلیمان اظہر ایم اے

شاہ احمد رضا خاں بریلوی کو آپ سے متعارف کیا جائے

اور

ع زباں بھی ہے ہمارے منہ میں تابِ سخن بھی ہے

قارئین کرام! ہم چاہتے ہیں کہ آج کی نشست میں آپ کو شاہ احمد رضا خاں سے متعارف کروایا جائے۔ کیونکہ آپ کی شخصیت اپنے افکار و خیالات اور کد و کاوش کے باعث بریلوی مکتبِ فکر کی بانی سمجھی جاتی ہے۔ اور آج انہیں مجدد مأتہ حاضرہ کے لقب سے ملقب کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ تحریک آزادی میں قیادت کا سہرہ بھی انہی کے سر سجایا جا رہا ہے۔ ہمیں ان کی ذہانت و فطانت سے انکار نہیں ہے۔ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ بالکل اوائل عمر میں ہی علوم درسیہ سے فارغ ہو کر مسند درس و افتاء کی زینت بن گئے تھے۔ لیکن جیسا کہ مولانا ابو الکلام نے کہا کہ مدرسوں اور حجروں کا کام تو ہوتا ہی چلا آیا ہے۔ اور غلامی میں مسلمان قوم کو قعرِ ذلت سے نکالنے کی خاطر مدرسوں اور حجروں کو چھوڑ کر میدانِ کارزار میں آ جانا حقیقی عظمت تھی۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ شاہ احمد رضا خاں میدانِ جہاد میں نہ نکل سکے بلکہ آپ نے مجاہدینِ آزادی کی مخالفت کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔

جماعتوں کو اپنے بانیوں یا قائدین سے محبت و عقیدت کا تعلق ہونا ایک فطری بات ہے۔ اسی لئے بریلوی حضرات آپ سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ کسی نے کہا "حبك الشيء يعمي ويصم"۔ بریلوی حضرات کو بھی محبت نے اندھا کر دیا ہے اور دنیا جہاں کی ہر خوبی ان کے پلڑے میں ڈال دی ہے۔ ہمیں انکی علمیت یا شانِ افتاء سے بحث نہیں ہے۔ ہمیں تو ان سرگرمیوں کو دیکھنا ہے جو انگریز کو برِصغیر سے نکالنے اور امتِ مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ضروری تھیں۔ اس سلسلہ میں جب مرزا رجب علی بدایونی نے ۱۸۹۸ء میں ہندوستان کے دار الحرب یا دار الاسلام ہونے کے متعلق آپ سے استفسار کیا تو آپ نے فرمایا:

"ہمارے امام اعظمؒ بلکہ علماء ثلاثہؒ کے مذہب پہ ہندوستان دار الاسلام ہے۔ ہرگز دار الحرب نہیں۔ کہ دار الاسلام کے دار الحرب ہو جانے میں جو تین باتیں ہمارے امام اعظم امام الائمہ کے در کار ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ وہاں احکام شرک اعلانیہ جاری ہوں اور شریعت کے احکام و شعائر مطلقاً جاری نہ

ہونے پائیں اور صاحبین کے نزدیک اسی قدر کافی ہے۔ مگر یہ بات بحمد اللہ یہاں قطعاً موجود نہیں ہے۔ اہل اسلام جمعہ وعیدین و اذان و اقامت و نماز باجماعت وغیرہا شعائر شریعت بغیر مزاحمت علی الاعلان ادا کرتے ہیں۔ فرائض، نکاح، رضاع، طلاق، عدت، رجعت، مہر، خلع، نفقات، حضانت، نسب، ہبہ، وقف، وصیت، شفعہ وغیرہا بہت معاملات مسلمین ہماری شریعت غرا بیضاء کی بناء پر فیصل ہوتے ہیں کہ ان امور میں حضرات علماء سے فتویٰ لینا اور اسی پر عمل و حکم کرنا حکام انگریزی کو بھی ضرور ہوتا ہے۔ اگرچہ ہنود مجوس و نصاریٰ ہوں۔ اور بحمد اللہ یہ بھی شوکت و جبروت شریعت علیہ عالیہ اسلامیہ اعلی اللہ مقامہ السامیہ کہ مخالفین کو بھی اپنی تسلیم و اتباع پر مجبور کرتی ہے۔" (اعلام الاعلام بان ہندوستان دارالاسلام طبع حسنی پریس دہلی ص ۲)

قارئین محترم! یہ فتویٰ جو مولانا احمد رضا خان نے دیا اسے بار بار پڑھ کر بتائیے کہ حکیم مشرق علامہ اقبال کا درج ذیل شعر ایسے ہی مفتیان کرام کیطرف اشارہ تو نہیں کرتا ؎

ملاّں کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

ہمیں افسوس ہے کہ وہ وارثان منبر رسول ؐ جنہوں نے ملت اسلامیہ کی رہنمائی کر کے خلافت الٰہیہ کے قیام کی کوشش کرنا تھی وہ نہ معلوم وجوہ کی بنا پر غیر ملکی استعمار و استبداد کی محکومی پر قناعت کا سبق دینے لگے۔ جن لوگوں کو مسیحا بن کر قوم کے تن مردہ میں از سر نو روح پھونکنا تھی، وہ خواب غفلت سے انگڑائی لیکر اٹھتی ہوئی قوم کو شوگر کوٹڈ فتووں کی گولیاں کھلا کر محکومی کی نیند سلانے لگے۔ کہاں یہ بلندی کہ جہانگیر جیسے مسلم حکمران کے سامنے ایک عالم دین نے جھکنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور کہاں یہ پستی کہ ایک دوسرا عالم دین ایک کافرہ مشرکہ حکمران عورت کی غلامی پر صابر و شاکر ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ ؎

زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

حکیم مشرق علامہ اقبال نے ضرب کلیم میں پیر حرم کو خطاب کر کے فرمایا تھا ؎

اے پیر حرم رسم و رہ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوا ہائے سحری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

یعنی علمائے دین پر واجب ہے کہ محکومی کے باعث مسلمان قوم کے مسخ شدہ کردار کی از سر نو تشکیل کیلئے

کوئی راہِ عمل ڈھونڈیں، جس پر عمل کر وہ دوبارہ قیادت اقوام کے منصب پر فائز ہو سکیں جو اسلام کا مقصود و مطلوب ہے۔ لیکن شیخ کلیسا نواز اس کے برعکس ایسے اقدامات میں مصروف ہو گئے جن سے غلامی کے بندھن مضبوط تر ہوتے چلے گئے۔ دو رکعت کے یہ امام اس بات پر الحمدللہ کا ورد کرنے لگے کہ انہیں انگریز نے فتویٰ بازی کی اجازت دے رکھی ہے۔ انہیں اس بات کی ذرہ بھر پرواہ نہ تھی کہ ہندوستان کو دارالاسلام قرار دینے سے اسلام کی عزت و حرمت اور مسلم مفادات پر کتنی کاری ضرب لگے گی قافلہ حریت کی راہ میں کتنی رکاوٹیں کھڑی ہو جائیں گی اور آزادی کی منزل کتنی دور ہو جائے گی، لیکن ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ چونکہ ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے سے جہاد واجب ہو جائے گا تو انہیں آرام و تعیش کی زندگی کو خیر باد کہہ کر رسم شبیری پر کاربند ہونا پڑے گا۔ اور یہ راستہ اتنا کٹھن ہے کہ بے چارے احمد رضا خان کو ایک طرف بریلوی حضرات کے مجاہد کبیر علامہ فضل حق بھی اس راہ کے مصائب سے بلبلاتے نظر آتے ہیں۔

(حوالہ کے لئے دیکھئے باغی ہندوستان)

شاہ احمد رضا خان کا دامن تحریکِ آزادی میں خدمات کے لحاظ سے بالکل خالی ہے۔ بلکہ انہوں نے تو ہر ممکن طریق سے تحریک کی پشت میں خنجر گھونپنے کی کوشش کی تھی۔ جیسا کہ ترک موالات کے دوران آپ نے انگریزی مفادات کی پاسبانی کرتے ہوئے پورے برصغیر کے مجاہدینِ آزادی کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور یہ ان کی زندگی کا اتنا بڑا سانحہ تھا کہ پروفیسر محمد مسعود کو "اعلیٰ حضرت اور ترکِ موالات" نامی کتاب لکھ کر اپنے اعلیٰ حضرت کے دامن سے یہ بدنما داغ دھونے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ وہ بے چارہ اس شعر کا مصداق ہو کر رہ گیا ہے ؎

سخت کوشی ہائے ایں آلودہ دامانے نگر ۔ شوئد از دامانِ ہستی داغ ہائے کہنہ را

پروفیسر موصوف سے ہماری یہ گذارش ہے کہ ہو سکتا ہے کہ مولانا احمد رضا خان علمی طور پر مقام رفیع کے مالک ہوں لیکن سفید فام حکمرانوں کے مفادات کی پشتیبانی میں بھی ان کا مقام بہت آگے ہے۔ جب انگریزوں نے کانگریس قائم کی تو آپ نے ۱۸۸۰ء میں فتویٰ دیا کہ مسلمانوں کیلئے کانگریس میں شامل ہونا جائز اور مباح ہے۔ اور سرسید تعاون ناجائز ہے۔ فتویٰ کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید ان کے نزدیک اشرار میں سے تھے۔ اور ہندو و انگریز ابرار تھے۔ (یہ فتویٰ نصرۃ الابرار کے نام سے لدھیانہ سے چھپ چکا ہے۔) کیونکہ کانگریس دراصل انگریزی مفادات کو تقویت دینے اور مسلمانوں کو ابدی طور پر غلام بنائے رکھنے کیلئے قائم ہوئی تھی۔ اور اس جماعت کے بنیادی مقاصد آزادی کیلئے جدوجہد شامل نہ تھی۔ جب رفتہ رفتہ سیاسی بیداری کا دور آیا۔ کانگریس کے عزائم استخلاص وطن از بیگانگان لعبید الوطن کی صورت میں ظاہر ہوئے اور

اس نے مسلمانوں کی اعانت سے آزادی کی تحریک شروع کی تو اس سلسلے میں انگریزی مال کا بائیکاٹ اہم حربہ سمجھا گیا۔ قائدین ہند کا خیال تھا کہ انگریز اپنا تیار شدہ مال ہند کی وسیع منڈی میں من مانے بھاؤ بیچ کر ہماری دولت سے خود مضبوط تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ اگر انگریزی مصنوعات کا بائیکاٹ کر دیا جائے تو ان کی معیشت تباہ ہو جائے گی اور سبھی جانتے ہیں کہ معاشی طور پر مفلوج قوم سیاسی طور پر بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اس طرح انگریز ہندوستان سے نکلنے پر مجبور ہو جائے گا۔ لیکن چونکہ اس تحریک کی کامیابی سے انگریزی اقتدار پر زد پڑتی تھی اس لئے وہی احمد رضا خان جو مسلمانوں کے لئے کانگریس میں شمولیت جواز کا فتویٰ دے چکے تھے۔ اب فوراً گرگٹ کیطرح رنگ بدل گئے۔ اور فتویٰ دیدیا کہ اہل کتاب کے بالمقابل ہندوؤں سے تعاون کر کے بائیکاٹ کی تحریک چلانا خلافِ اسلام ہے۔

اب تھوڑی دیر کے لئے اعلام الاعلام نامی فتویٰ کی جانب واپس چلئے، کیونکہ ہم اسکی روشنی میں چند امور کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

حضرۃ الامام شاہ محمد اسمٰعیل شہید دہلوی نے انگریزوں کے مقبوضات سے نکل کر سکھوں سے مقابلہ کیا۔ جبکہ سکھوں نے اپنی حدود مملکت میں مساجد بند کر رکھی تھیں۔ اذان دینے پر پابندی تھی۔ ذبیحہ گاؤ ممنوع تھا۔ فرائض اسلامیہ کی بجا آوری میں ہر ممکن رکاوٹ ڈالی جارہی تھی۔ کسی مسلمان کی عزت و آبرو محفوظ نہ تھی۔ اس کے برعکس باقی ہندوستان پر اگرچہ انگریزوں کا تسلّط تھا۔ لیکن ۱۸۲۶ء کے تسلّط اور ۱۸۹۸ء کے تسلّط میں ایک نمایاں فرق موجود ہے۔ کیونکہ ۱۸۲۶ء میں مغل بادشاہ ملک کا قانونی حکمران تھا۔ اور کسی نہ کسی شکل میں اسلامی حکومت باقی تھی جبکہ ۱۸۹۸ء میں ملک کلیتاً انگریزوں کے تسلّط میں تھا۔ آج یہ طعنہ دیا جاتا ہے۔ کہ مجاہدین نے سکھوں سے پنجہ آزمائی کیوں کی اور انگریزوں سے کیوں نہ ٹکرائے۔

صاحب من! آپ کے مجدّد تو شاہ برطانیہ کی عملداری میں شامل ہندوستان کو دارالاسلام قرار دے رہے ہیں اور شاہ اسمٰعیل سے یہ توقع رکھتے ہیں۔ کہ اس دارالاسلام میں جنگ کرے۔ اور سکھوں کا پنجاب آپ کے مجدّد کے نزدیک دارالحرب ہے۔ کیونکہ جو شرائط احمد رضا خاں صاحب نے دارالحرب کیلئے ضروری قرار دی ہیں وہ من وعن رنجیت سنگھ کے پنجاب میں موجود ہیں۔ جب شاہ اسمٰعیل اس دارالحرب کو دارالاسلام میں تبدیل کرنے کیلئے کمر ہمت باندھتا ہے۔ تو وہ انگریزوں کا ایجنٹ بن جاتا ہے۔ فکر و عمل میں یہ کس قدر بھیانک تضاد ہے۔

پھر حضرت شاہ اسمٰعیل تو اس فتویٰ کی بنیاد پر راہ جہاد میں گامزن ہوئے تھے۔ ان کے چچا شاہ عبدالعزیز نے دیا تھا، جس میں انگریزوں کا ہندوستان (جہاں برائے نام بہادر شاہ ظفر یا اس کا باپ ہی حکمران

کیوں نہ ہو۔) دارالحرب قرار دیا جا چکا تھا۔ لیکن آپ کے مجدد بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھ کر محض فتویٰ بازی کی اجازت ہونے پر ۱۸۹۰ء کے ہندوستان کو دارالاسلام قرار دئیے جا رہے ہیں۔

شاہ محمد اسماعیل سکھوں سے ٹکرائے۔ اس لئے کہ ان کی بنیاد جہاں سے انہیں سپاہی اور سرمایہ مہیا ہوتا تھا، انگریزوں کے زیر تسلط تھی۔ براہ راست مقابلہ کی صورت میں انگریز سب سے پہلے اس بنیاد کو ختم کر کے تحریک کا خاتمہ کر دیتے۔ سرحد کا علاقہ نسبتاً آزاد تھا۔ پہاڑوں میں رہ کر تھوڑے سامانِ جنگ اور قلیل تعداد کے ساتھ بڑے دشمن کا مقابلہ کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے وہ میدانی علاقوں سے نکل کر کوہستانوں کی جانب چل دئے۔ پروگرام یہ تھا کہ وہاں کے مقامی افراد کی اعانت حاصل کر کے پہلے چھوٹے دشمن (سکھوں) کا خاتمہ کیا جائے گا۔ اور کشمیر و پنجاب میں اسلامی حکومت قائم کر کے بقیہ ہندوستان کو انگریز کے پنجۂ استبداد سے چھڑایا جائے گا۔ بتائیے اس منصوبے میں کیا خامی ہے۔ لیکن انگریزوں کے ہندوستان کو دارالاسلام قرار دینے اور ان کی سرپرستی میں گل چھرے اڑانے والوں کو سر بکف مجاہدین کی یہ ادا ایک آنکھ نہ بھائی۔ کیونکہ تعیش پسندوں کو اسلامی حکومت کا احتساب کیونکر گوارا ہو سکتا تھا۔ قضائے عمری پر اکتفا کرنے والوں کو نمازِ پنجگانہ کی پابندی کیونکر گوارا ہو سکتی تھی۔ اجمیر۔ کلیر۔ لاہور۔ پاکپٹن اور کوٹ مٹھن جا کر چند روپوں کے خرچ سے حج کا ثواب حاصل کر لینے والوں کو مہینوں کا سفر کر کے اور ہزاروں روپیہ خرچ کر کے حرمین جانا کس طرح پسند آ سکتا تھا۔ (ان لوگوں کا فتویٰ تھا کہ بحری سفر میں جان کا خطرہ ہونے کے باعث حج کی فرضیت ساقط ہو چکی ہے۔) قل۔ ساتے۔ چالیسویں اور گیارہویں پر اپنی معیشت کا مدار رکھنے والوں کو خون پسینہ ایک کر کے رزقِ حلال حاصل کرنا کیوں کر آسان معلوم ہو سکتا تھا۔ اور بابا فرید الدین مسعود گنج شکر کے مزار کے دروازے سے گزر کر جنت میں پہنچ جانے والوں کو شمشیروں کے سائے تلے جنت کی تلاش کیوں کر گوارا ہو سکتی تھی۔ اس لئے ان لوگوں کو شاہ اسماعیل کے عزائم پسند نہ آئے۔ اور سرحد میں پروپیگنڈہ کر دیا گیا کہ یہ لوگ بدعقیدہ ہیں، بزرگوں کو نہیں مانتے۔ پیغمبروں کا احترام نہیں کرتے۔ وہابی ہیں، یہ ہیں اور وہ ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں کی اعانت کے سہارے تحریک نے آگے بڑھنا تھا وہی خوانین خون کے پیاسے ہو گئے۔ اور مجاہدین کا بیشتر حصہ بالاکوٹ کے سانحہ کی نذر ہو گیا۔ فریقین اپنی اپنی مراد کو پہنچ گئے۔ مجاہدین جامِ شہادت سے سرفراز ہو گئے۔ اور انگریزوں کے ہندوستان کو دارالاسلام سمجھنے والے کلیتاً انگریزوں کی سرپرستی میں آ گئے۔ وقت گذر گیا تو آج یہ کہا جا رہا ہے کہ ہم تحریک آزادی کے ہیرو ہیں۔ بھئی جب آپ کے مذہب میں انگریزوں کے خلاف بغاوت، جہاد اور جدوجہد ہی ناجائز تھی۔ تو پھر آپ نے اگر کچھ کیا ہو گا۔ تو ان کے قدم مضبوط کرنے کی کوشش کے علاوہ اور کیا کیا ہو گا۔ جدوجہد

آزادی میں حصہ لینے کی سعادت ہر کس و ناکس کے حصہ میں نہیں آتی بلکہ ؎

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

بات مولانا احمد رضا خان کے فتویٰ کی ہو رہی تھی۔ ہم حیران ہیں کہ اگر وہابیوں کے کسی اہل قلم کے قلم سے انگریزوں کی حمایت میں کچھ نکل جائے تو وہ انگریزوں کے ایجنٹ اور پشتینی وفادار شمار کئے جاتے ہیں اور اگر احمد رضا خاں ان سے کئی قدم آگے بڑھ کر انگریزی مقاصد کی آبیاری فرمائیں تو وہ اُلٹے اعلیٰ حضرت بن کر سرخیل تحریک آزادی ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر کسی وہابی کے قلم سے غیر مناسب بات نکلی ہے تو وہ اسوقت بات کی ہے، جب ۱۸۶۵ء کے بعد وہابیوں پر مقدمات بغاوت چل رہے تھے۔ ان کی جائیدادیں ضبط ہو رہی تھیں۔ انہیں پھانسیوں پر لٹکایا جا رہا تھا۔ کالا پانی میں وہابیوں کی کالونی بنائی جا رہی تھی اور ان کے اعزہ واحباب واقارب کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ ان حالات میں ایسے لوگوں نے اپنی جماعت کو بچانے اور انگریزوں کے انتقامی جذبات کو اعتدال پر لانے کیلئے اگر مقام عزیمت سے ہٹ کر مقام رخصت کی کچھ باتیں لکھ دی ہیں تو اہل نظر کے نزدیک یہ کوئی جرم نہیں ہیں، جبکہ ان کے ارادے اور ہمتیں وہی تھیں جو سرحد پر برسرکار وہابیوں کی تھیں۔ وہ تو صرف انگریزی آنکھوں میں دھول جھونک کر جماعت کو بچانا اور از سر نو اسے اتنا طاقتور بنانا چاہتے تھے تاکہ دشمن کو ناکوں چنے چبوائے جا سکیں۔

مولانا احمد رضا کے اس فتویٰ کے ضمن میں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس سے برسوں قبل حضرت شاہ عبدالعزیز اسی ہندوستان کو دارالحرب قرار دے چکے تھے اور جن دلائل و وجوہ کے باعث مولانا احمد رضا نے ہند کو دارالاسلام کو قرار دیا تھا، وہ شاہ صاحب کے بھی سامنے تھے، لیکن انہوں نے فرمایا تھا کہ ظاہر حال کو حقیقت حال پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں بزرگوں کے اس متضاد طرز عمل سے آپ کو بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ کس میں کون بول رہا ہے۔ اور اقبال ؒ نے یہ شعر کس موقع کیلئے ارشاد فرمایا تھا ؎

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں	کرگس کا جہاں اور ہے شاہین کا جہاں اور

یہ شاہ احمد رضا خان جو خان بھی ہیں اور شاہ بھی (اور پھر اعلیٰ حضرت بھی جبکہ تمام پیغمبرؑ اور صحابہؓ صرف حضرت ہیں۔ اس کے باوجود انبیاء وصلحاء کے گستاخ ہونے کا طعنہ وہابیوں کو دیا جاتا ہے۔) بانس بریلی میں جو "اُلٹے بانس بریلی کو" والے محاورے کے باعث عوام الناس میں معروف ہے۔ ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے وقت آپ ایک سال کے طفل شیرخوار تھے۔ اور ۱۸۶۵ء کے ایام میں جب برصغیر کے مجاہدین آزادی مقدمات، بغاوت، ضبطیٔ جائیداد، انہدام قبور و مکانات، بیدزنی، پھانسی اور حبس دوام بعبور دریائے شور کے مراحل سے گذر رہے تھے، آپ اپنے والد محترم کی انگلی پکڑ کر

چلنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ہمارے بریلوی احباب کا کہنا ہے کہ انہوں نے اوائل عمر میں ہی علوم درسیہ سے فراغت حاصل کر لی تھی۔ اور ۵۰ سے زیادہ علوم میں ماہر ہو گئے تھے۔ ان میں سے بعض ایسے علوم بھی ہیں جن کے ماہر اساتذہ اس وقت کے برصغیر میں گنے چنے اور معروف تھے، لیکن آپ کے اساتذہ میں ان کا نام نہیں آتا۔ اور بعض علوم ایسے ہیں جن کا ماہر اس وقت کے برصغیر میں کوئی نہ تھا۔ خدا جانے یہ دونوں قسم کے علوم آپ نے کہاں سے سیکھ لئے تھے۔ پھر آپ نے تالیف وتصنیف اور درس وافتاء کا مشغلہ اپنایا اور بتایا جاتا ہے کہ آپ نے ایک ہزار سے زائد کتابیں لکھیں، لیکن قرب زمانی کے باوجود آج تک کوئی بریلوی محقق ہزار کتابوں کا سراغ لگانا تو ایک طرف رہ گیا نام تک نہیں گنوا سکا۔ سنا جاتا ہے۔ کہ ہر صدی کا ایک مجدّد ہوتا ہے۔ اور اتفاق سے آپ نے دو صدیوں کا زمانہ دیکھا۔ یعنی تیرھویں اور چودھویں کا۔ بریلوی احباب انہیں مجدد مائتہ حاضرہ کہتے ہیں۔ اور یہ تیرھویں صدی سے کہا جارہا ہے۔ اور آج بھی کہا جاتا ہے، گویا آپ کو یہ شرف حاصل ہے کہ آپ دو صدیوں کے مجدّد ہیں۔ یا پھر بریلوی حضرات فیصلہ نہیں کر سکے کہ آپ کو دراصل کس صدی کا مجدّد کہا جائے۔ جس طرح حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو پہلی صدی کا، حضرت امام شافعیؒ کو دوسری صدی کا، حضرت احمد سرہندیؒ کو گیارھویں صدی اور شاہ ولی اللہ کو بارھویں صدی کا مجدّد کہا جاتا ہے۔ بہرحال یہ احمد رضا خان صاحب کے علمی کارناموں پہ منحصر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ان تمام مجددوں سے بڑھ گئے ہوں اور دو صدیوں کے مجدّد کا اعزاز پا گئے ہوں۔ لیکن ہمیں حیرت ہے کہ آج مولانا احمد رضا خاں کو آزادیٔ ہند کا علم بردار بھی قرار دیا جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ کیونکہ متحدہ ہندوستان میں تحریک آزادی کے لئے جتنی بھی انجمنیں وجود میں آئیں خواہ وہ مسلم لیگ ہو یا جمعیۃ العلماء ہند یا مجلس احرار۔ ان تمام انجمنوں کے لیڈروں، ممبروں ان کے ساتھ دامے درمے، قدمے سخنے تعاون کرنے والوں پر جناب احمد رضا خاں اور ان کے خاص معتقدین نے کفر کا فتویٰ لگایا اور ان سے تعاون کرنا حرام قرار دیا تھا۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں "الدلائل القاہرہ علی الکفر النیاشرہ در بارہ کاٹھیاواڑ ایجوکیشنل مسلم کانفرنس" میں احمد رضا خاں سے لیکر مولوی دیدار علی شاہ الوری ثم لاہوری علماء بریلوی۔ کلکتہ جبل پور بہار۔ کانپور۔ سندھ۔ حیدرآباد۔ سیتاپور۔ کاٹھیاواڑ۔ شاہجہان پور۔ رام پور اور لاہور کے ۸۰ بریلوی مقتدر علماء کے دستخط موجود ہیں اور اس میں بالاتفاق لکھا ہے۔ کہ "اس مسلم کانفرنس میں شمولیت اور مالی امداد دینا حرام ہے" اور اسی فتویٰ سے مسلم لیگ میں شمولیت حرام ثابت کی گئی ہے۔

"احکام نوریہ شرعیہ بر مسلم لیگ" میں مولوی حشمت علی رضوی (جو اپنے آپ کو سگِ دربارِ رضویہ لکھتے ہیں۔ اور مولانا احمد رضا خاں کے بعد چوٹی کے بریلوی اکابرین میں شمار ہوتے ہیں) لکھتے ہیں:

"وہ اغراض و مقاصد جن کیلئے مسلم لیگ بنائی گئی ہے، وہی اصولِ شرعیہ و احکامِ اسلامیہ کے منضاد و مخالف ہیں۔"

قارئین! کیا آپ کو معلوم ہے کہ لیگ ان کی نظر میں کس بناء پر مطعون ہے۔؟ خود ہی لکھتے ہیں:
"تھانوی کو لیگیوں کی تقریروں تحریروں میں شیخ الاسلام کہا جاتا ہے۔ حکیم الامت لکھا جاتا ہے۔ لیگ کے اجلاس میں تھانوی کا پیغام خاص احترام اور اہتمام سے لیا اور سنا جاتا ہے۔" (ص ۲۱)

"مسلم لیگ کی زریں بخیہ دری" مصنفہ سید اولادِ رسول قادری برکاتی مارہروی سجادہ نشین مارہرہ شریف۔" مسلم لیگ کا یہی جرم بایں الفاظ بیان کیا گیا ہے۔:
"لیگی جب فخر سے کہتے ہیں کہ کیا حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی زندہ باد کے نعرے لگائے جاتے ہیں۔" (ص ۷) خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، آیئے اصل مطلب کی جانب۔

"الجوابات السنیہ علی زہاء السوالات اللیگیہ" مصنفہ اولادِ رسول مارہروی میں مصنف لکھتا ہے:
"جو لوگ ان مقاصد اساسیہ لیگیہ کو سمجھتے ہوئے ممبر بنیں گے وہ خود بد مذہب ہو جائیں گے۔" (ص ۱۱)

گویا اس فتویٰ کی رو سے برصغیر کے کئی کروڑ مسلمان جنہیں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر تحریکِ آزادی میں شمولیت کا اعزاز حاصل ہے، سب کے سب بد مذہب ہیں۔

اس کے بعد فرماتے ہیں: "لیگ کے مقاصد اساسیہ جو صریح محرمات، ضلالات بلکہ منجر کفریات ہیں۔" (ص ۱۴)

اسی رسالہ کے صفحہ ۲۹ سے ۳۲ تک جناب ابوالبرکات احمد شاہ صاحب مرکزی انجمن حزب الاحناف لاہور کا فتویٰ درج ہے جس میں موصوف فرماتے ہیں: "لیگ کی حمایت کرنا، اس میں چندے دینا اس کا ممبر بننا، اسکی اشاعت و تبلیغ کرنا منافقین و مرتدین کی جماعت کو فروغ دینا ہے۔ اور دینِ اسلام کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔"

گویا سارے برصغیر کے مسلمان مرتد اور منافق ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ مسلم لیگ آزادی کیلئے لڑ رہی تھی اور ان بریلویوں کے نزدیک انگریزوں کو ملک سے نکالنے کی جدوجہد کرنا ارتداد اور نفاق ہے۔ اور "تجانب اہل السنۃ عن اہل الفتنۃ" از مولوی محمد طیب صاحب داناپوری، قادری، برکاتی میں لکھا ہے۔ "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ندوۃ العلماء، خدام کعبہ، خلافت کمیٹی، جمعیۃ العلماء ہند، خدام الحرمین، اتحادِ ملت، مجلس احرار، مسلم لیگ، اتحاد کانفرنس، مسلم آزاد کانفرنس، نوجوان کانفرنس،

نمازی فوج، جمعیت تبلیغ اسلام انبالہ، سیرت کمیٹی پٹی ضلع لاہور۔ آل پارٹیز کانفرنس وغیرہ کمیٹیاں انہی کافروں نیچریوں نے بنائی ہیں۔" (ص: ۹)

بتائیے مسلمانوں کی کون سی تنظیم ان لوگوں کے فتویٰ کفر کی زد سے بچ سکی ہے۔ جو جماعتیں اس فتویٰ میں شامل نہیں ہیں۔ وہ اسی کتاب کے ایک دوسرے اقتباس میں ملاحظہ فرمائیے جو ہم کسی دوسری جگہ درج کر چکے ہیں۔

یعنی انگریز کے سایہ میں حضرت خان صاحب بہادر (احمد رضا خان) اور ان کے متبعین نے تمام مسلم سیاسی و مذہبی جماعتوں کو کافر قرار دیدیا ہے۔ اب ہم انہی لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ اس عالمگیر قسم کی فتویٰ بازی کے بعد متحدہ ہندوستان میں کون شخص مسلمان رہ گیا تھا۔؟

قارئین یہ ہے ان لوگوں کی خدمت جو تحریک آزادی میں ان لوگوں نے سرانجام دی۔ اپنے آقا انگریز کو خوش کرنے کیلئے ان کی مخالفت میں اٹھنے والی ہر جماعت اور تنظیم کو بے دریغ فتویٰ کفر سے کچلنے کی کوشش کی ہے۔ حکومت وقت ان پہ مہربان تھی، اس لئے ان کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی۔ سچ ہے ع

سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کا ہے کا

یہ تو جماعتوں کی بات تھی، اب افراد کیطرف آیئے:

"بحکم شریعت مسٹر جینا (جناح) اپنے عقائد کفریہ قطعیہ یقینیہ کی بنا پر قطعاً مرتد اور خارج از اسلام ہے۔ جو شخص اس کو مسلمان جانے یا اسے کافر نہ مانے یا اس کے مرتد ہونے میں شک رکھے یا اس کو کافر کہنے میں توقف کرے وہ بھی کافر مرتد۔" (تجانب اہل السنۃ۔ ص ۱۲۲)

"حسن نظامی دہلوی بھی کافر ہے۔" (" ص ۱۲۲)

"شبلی نعمانی اور الطاف حسین حالی بھی کافر ہے۔" (" ص ۲۸۹)

علامہ اقبالؒ پر تو ۱۴ صفحے سیاہ کئے گئے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر اقبال نے دہریت والحاد کا زبردست پروپیگنڈہ کیا ہے۔" (تجانب۔ ص ۳۴۳)

"ڈاکٹر صاحب کی زبان پر شیطان بول رہا ہے۔" (تجانب۔ ص ۳۴۰)

"مسلمان اہل السنت خود ہی انصاف کریں کہ ڈاکٹر صاحب کے مذہب کو سچے دین اسلام سے کیا تعلق ہے۔" (تجانب۔ ص ۳۴۱)

مفکر اسلام حکیم مشرق ڈاکٹر اقبال پر سب سے پہلے کفر کا فتویٰ مولوی سید دیدار علی شاہ والد ماجد سید ابوالبرکات احمد انجمن حزب الاحناف لاہور نے لگایا تھا۔ لوگ عموماً کہا کرتے ہیں کہ علماء نے ڈاکٹر

صاحب پر فتویٰ کفر لگایا تھا۔ ہم پورے وثوق کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ علماء دیوبند و علماء اہل حدیث نے قطعاً ایسا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں یہ خدمت تحریک آزادی کے نام نہاد اجارہ داروں یعنی بریلوی علماء نے سرانجام دی تھی۔

بات دراصل یہ ہے کہ جب انگریز بہادر یہاں تشریف لایا اور اس نے مکر و فریب سے سلطنت ہتھیالی تو اسے مضبوط کرنے کیلئے اس نے دو افراد کی خدمت حاصل کی۔ ایک کو تو اپنا نبی بنا کر مبعوث کیا جس نے بعثت کے ساتھ ہی جہاد کی تنسیخ کا اعلان کر کے مجاہدین آزادی کی پشت میں چھرا گھونپ دیا۔ اور دوسرے کو مجدد بنا دیا جس نے انگریز کے خلاف جدوجہد کرنے والوں پر کفر کی مشین چلا کر عوام میں انہیں بدنام کرنے کی پوری کوشش فرمائی۔ اس مجدد نے اس موضوع پر خاص طور پر دو کتابیں لکھیں ایک کا نام ــــ "کتاب الامارۃ والجہاد" ہے۔ جس میں جہاد کی ایسی شرائط بیان کیں کہ وہ منسوخ قرار نہ دئے جانے کے باوجود ہند میں ناممکن ضرور ہو گیا۔ اور دوسری کتاب "اعلام الاعلام بان ہندوستان دارالاسلام" ہے۔ جس میں ببانگ دہل یہ اعلان کیا کہ ہندوستان دارالاسلام ہے۔ یعنی انگریز بہادر کے خلاف بغاوت نہ کی جائے اور جہاد کا خیال دل سے نکال دیا جائے۔ یاد رہے کہ یہ وقت ایسا تھا جب مجاہدین آزادی بار بار یہ اعلان کر رہے تھے کہ ہندوستان دارالحرب ہے اور اسے دارالاسلام بنانے کیلئے انگریز کو یہاں سے نکال کر اسلامی مملکت کا احیاء کیا جائے۔

اللہ کی شان ہے کہ رائے بریلی سے پیدا ہونے والا مجدد (سید احمد) جہاد کرتے ہوئے بالاکوٹ میں جام شہادت سے سرفراز ہو گیا اور اسکی ایک ہم نام بستی بانس بریلی میں پیدا ہونے والا مجدد ہندوستان میں جہاد کو ممنوع قرار دے رہا ہے۔ بانس بریلی کے اس مجدد نے نہ صرف اپنے ہم عصر مجاہدین پر گولہ باری کی بلکہ اپنے سے پہلے مجاہدین کو بھی معاف نہیں کیا۔ شاہ اسماعیلؒ تو ان کی کفر ساز مشین گن کا پہلا نشانہ تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ جنہوں نے سب سے پہلے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا تھا۔ انہیں بھی اپنی قلمی سخاوت سے محروم نہ رکھا۔ اس طرح امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ جیسے اکابرین کو بھی وہابیوں یعنی انگریز کے باغیوں کا پیشوا قرار دیکر مطعون کیا۔ اور اپنی تمام تصانیف میں ان تینوں بزرگوں کو کہیں بھی رحمۃ اللہ علیہ نہیں لکھا۔ متحدہ ہندوستان میں ان بزرگوں سے جو لوگ عقیدت رکھتے تھے انگریزوں نے انہیں وہابی کے خطاب سے نوازا تو حضرت شاہ احمد رضا خاں صاحب نے وہابیوں کے متعلق یہ فتویٰ جاری فرمایا:

"آجکل کے وہابی رافضی وغیرہ ایسا شخص سب سے مرتد ہے۔ اس سے جزیہ نہیں لیا جا سکتا۔

اس کا نکاح کسی مسلم کافر مرتد اس کے ہم مذہب ہوں یا مخالف مذہب غرض انسان حیوان کسی سے نہیں ہو سکتا۔ جس سے ہوگا محض زنا ہوگا۔ مرتدوں میں سب سے بدتر منافق ہے۔ خصوصاً وہابیہ دیوبندیہ۔" (احکام شریعت)

تمہید ایمان اور حسام الحرمین میں حضرت خان صاحب گالی گلوچ پر اتر آتے ہیں۔ ص ۷۳ سے ۸۳ تک پورے دس صفحات میں گالیوں کی ایک طویل فہرست مرتب کی ہے۔ جو قابلِ دید ہے ——

" دوزخ کے کتے " آپ کا تکیہ کلام ہے۔ ص ۱۲ پر مناظرانہ رنگ میں اُلّو، گدھے، سُور بھی کہہ دیا ہے۔ مگر غصہ ہے کہ تھمتا نظر نہیں آتا۔ کتاب میں کئی جگہ وہابیوں کو واجب القتل قرار دیا ہے۔ ایک وہابی کو قتل کرنا سو کافر کے قتل سے افضل قرار دیا ہے۔ اور بادشاہ اسلام اس کام کا مجاز ہے۔

ص ۶۸ پر لکھتے ہیں، " یہودی کا ذبح کیا ہُوا جانور حلال ہے۔ اگر خدا کا نام لے کر ذبح کرے وہابی دیوبندی وغیرہ کا ذبیحہ نجس اور مردار قطعی ہے۔ اگرچہ لاکھ بار خدا کا نام لے۔ یہ سب مرتد ہیں۔"

قارئین! آپکو پتہ ہے اسکی وجہ کیا ہے۔؟ صرف یہ کہ وہابی خاں صاحب کا وہ فتویٰ نہیں مانتے تھے جس میں انہوں نے ہندوستان کو دارالاسلام قرار دیکر انگریز سے لڑائی کو ناجائز قرار دیا تھا ؎

پی گئے رند بادۂ گلگوں شیخ کہتا رہا حرام حرام

اور جوں جوں وہابیوں کی تحریک شدّت اختیار کرتی جاتی تھی خاں صاحب کا پارہ چڑھتا جاتا تھا۔ ان سے سوال ہُوا کہ وہابیوں کی بنائی ہوئی مسجد مسجد ہے یا نہیں۔؟ فرماتے ہیں: " کفار کی مسجد مثل گھر کے ہے۔" (ملفوظات جلد ۱ ص ۹۳)

اور " وہابی سے مصافحہ کرنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔" (فتاویٰ رضویہ) حالانکہ آپ کے نزدیک حقّہ کے پانی سے وضو جائز ہے۔

قارئین کرام! یہ ہیں بریلوی جماعت کے اعلیٰ حضرت عظیم البرکت رفیع المرتبت مجدّد مائتہ حاضرہ، صاحبِ تصانیف قاہرہ سرخیلِ تحریک حریت حضرت شاہ احمد رضا خاں صاحب، ایک تو وہ مجدّد تھے جنہوں نے اکبر کے دینِ الٰہی کا ڈنکے کی چوٹ مقابلہ کرکے اسے ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا۔ اور جن کی تعریف میں شاعرِ مشرق یوں نغمہ سرا ہیں: ؎

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے ہے اس کے نفسِ گرم سے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہبان اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار

اور فضائیں زبانِ حال سے پوچھ رہی ہیں ؎

کون آبلہ پا وادیٔ پُرخار سے گذرا کانٹوں سے مہک آتی ہے یہ کس کے لہو کی

اور ایک یہ مجدد ہیں جنہوں نے انگریز بہادر کے قدم مضبوط کیئے اور جب انگریز کے اقتدار کو ختم کرنے کیلیئے تمام مسلمان متحد ہوئے تو آپ نے ان پر کفر کی مشین چلا دی۔ کون نہیں جانتا کہ تحریک آزادی ہند میں علماء اہل حدیث اور علماء دیوبندہی پیش پیش تھے۔ اور شاہ احمد رضا خان جن کا انتقال ۱۹۲۲ء میں ہوا ان کا ساتھ دینے کی بجائے الٹی چال چل رہے تھے۔ ان کی وفات کے بعد انگریز کی خدمت کا منصب ان کے صاحبزادے حامد رضا خان صاحب نے سنبھال لیا۔ جب چھوٹے میاں نے مولانا ظفر علی خان پر تحریک آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں فتویٰ کفر لگایا تو مولانا ظفر علی خان نے فرمایا ؎

حامد رضا خاں آئے اوڑھ کر بدعت کا لحاف ذات اُن کی ہے مجدد بات ان کی لام کاف

مولانا ظفر علی خان پر سید ابوالبرکات احمد کے والد سید دیدار علی شاہ نے بھی فتویٰ کفر لگایا تھا۔ جس پر مولانا نے فرمایا ؎

فقیہہ مصلحت بین سے وہ رند بادہ خوار اچھا نکل جاتی ہے سچی بات جسکے منہ سے مستی میں

ہم علماء بریلی کے ان فتوؤں سے نہیں گھبراتے کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ برتن میں جو کچھ ہوتا ہے وہی باہر آتا ہے۔ جب ظرف متعفن چیزوں سے بھرا ہوا ہو تو اس میں سے مشک وعنبر کی خوشبو نہیں آئے گی۔ لیکن ہمیں افسوس اس بات کا ہے کہ آج کے بریلوی حضرات اپنا ماضی جانتے ہوئے بھی یہ دعویٰ کئے جا رہے ہیں کہ جنگ آزادی اور تحریک آزادی ہند کے سرخیل یہی لوگ ہیں۔ حالانکہ ان کے نامۂ اعمال میں سوائے مجاہدین کو تنگ کرنے اور انگریز کی چاپلوسی کے کچھ نہیں ہے ؎

ہزاروں قافلے آنے کو آئے یوں تو کنعاں سے کسی کے پاس یوسف سی متاع بے بہا کب تھی

ہمارے تذکرے تم پوچھنا اک دن غزالاں سے ہماری داستاں ہر خار کے نوک زباں ہوگی

ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ جان من! جب آپکے مجدد اور اعلیٰحضرت انگریز کے مقبوضہ ہندوستان کو دارالاسلام قرار دے رہے ہیں۔ انگریز کے سایۂ عاطفت کو ظل الٰہی سمجھتے ہیں تو آپ کس گورنمنٹ کے خلاف جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ وہ منصوروں کا قبیلہ ہی اور تھا جو راہ جہاد میں کروڑوں کی جائیدادیں چھوڑ کر سرحد کی سنگلاخ چٹانوں پہ اور برف پوش پہاڑوں میں باد و باراں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پورے ایک سو سال تک نعرۂ تکبیر کر کے قصر برطانیہ کے در و بام ہلاتا رہا۔ پھانسیوں کو شہادت سمجھتا رہا۔ بیڑیوں کو زیور سمجھ کر چومتا رہا۔ کالے پانیوں کو آب حیات تصور کرتا رہا۔ قید و بند کو سنت یوسفیؑ سمجھتا رہا۔ ضبطیٔ جائیداد کو ذخیرۂ آخرت گردانتا رہا ؎

کہ لوگ موت پہ مرتے ہیں زندگی کیلیئے یہ ہے کمال محبت یہ ہے مآل وفا

آپ کے حصے میں یہ سعادتیں کہاں۔! یہ لوگ شمشیر و سنان سے کھیل کر تقدیر امت بنا رہے تھے۔
اور آپ خانقاہوں میں طاؤس ورباب کو قوالی کا نام دیکر امت کو مدہوش کر کے غیر مسلم اقتدار کی بنیادیں مضبوط کر رہے تھے۔ ان لوگوں کی بازی گاہ میدان حرب تھا۔ اور آپ کے پیر اور گدی نشین دستر خوان کے بھکاری تھے۔ یہ لوگ انگریز کا ناک میں دم کئے ہوئے تھے اور آپ کے پیران کرام حضرت سید عبدالقادر جیلانی کے مزار پر گولیاں چلانے والی انگریزی سپاہ کے ہندوستانی اجیروں کو حفظ وامان کے تعویذ فروخت کر رہے تھے۔ یہ لوگ آزادی کی منزل کی جانب بڑھ رہے تھے اور آپ کے علماء کفر کے فتوؤں کے کانٹوں سے ان کا دامن الجھا کر انہیں منزل پر پہنچنے سے روک رہے تھے۔

قارئین! مقام افسوس ہے کہ جن شہیدانِ وفا کی ہڈیوں کی راکھ سے آزادی کا یہ قصر رفیع تیار ہوا ان کی عظمت کو سلام کرنے کی بجائے انہیں ملت اسلامیہ کے غدار اور انگریزوں کے پشتینی وفادار ہونے کے القاب تقسیم کئے جا رہے ہیں۔ حالانکہ ؎

مزاحمت ہے گردش جام پہ مزاحمت ہے کیفِ دوام پر
کہ چراغ محفل ناز میں ابھی جل رہا ہے مرا لہو

ہم ان دودھ پینے والے مجنونوں کے قبیلۂ بریلی سے پوچھتے ہیں کہ ان میں سے کون فرد ولائت علی کا ہم پایہ ہے۔؟ عنایت علی ثانی کون ہے؟ عبداللہ صادقپوری کے پاؤں کی خاک ہونے کا شرف ان میں سے کون حاصل کر سکا ہے۔؟ یحییٰ علی سی جانبازیوں اور سرفروشیوں کی مثال کون پیش کر سکتا ہے۔؟ شیخ الہند کا ہم سر کون ہے۔؟ احمد اللہ صادقپوری کا مثیل کون ہے۔؟ ؎

ہے کوئی اسد پیشہ بیابانِ اجل میں　　　　دیکھو تو کوئی میری طرح آبلہ پا ہے۔؟
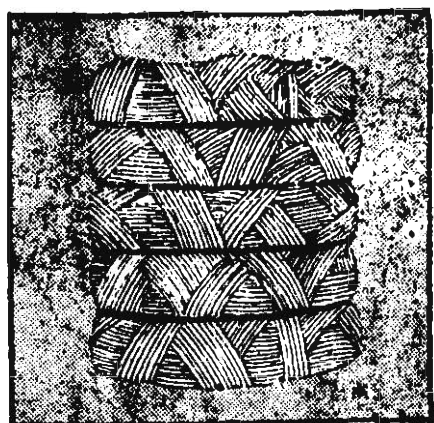
پیش کش مطلوب ہیں

اصل ڈیلروں سے اشیاء ذیل کیلئے پیش کش مطلوب ہے :-

۱۔ برساتی جامہ (ربڑ شیٹ) ۲۰۰۰ گز ۲۔ ٹوائلٹ کاغذ رولز ۵۰۰ رولز

۳۔ ٹوائلٹ صابن ۱۲ گروس ۴۔ دھلائی کا صابن ۵۰۰ کلوگرام

۵۔ صفائی کا پوڈر (وم یا متبادل) ۵۰۰ ٹین ۶۔ پلاسٹر آف پیرس ۵۰۰ کلوگرام

۷۔ فنائل چھڑکنے کیلئے۔ ۲۰۰ گیلن

ہر اشیا کا نمونہ آنا ضروری ہے۔ یا پیش کش میں وضاحت کریں :-

ا۔ جس اشیاء کی پیش کش کی جائے اس کا صحیح نام اور بنانے والے کا نام۔

ب۔ اسباب کا کرایہ، پیک کرنے کا خرچ اور بھیجنے کا انتظام

ج۔ ارسال کرنے کی شرائط۔

پیش کش ایک سیل بند لفافہ میں جس پر "پیش کش" لکھا جائے زیر دستخطی کے پاس ۱۱/۱۰/۶۷ تک پہنچنی چاہئیں۔

یہ حق محفوظ رکھا جاتا ہے کہ کسی ایک پیش کش کو منظور کرنے یا پیش کش کی تاریخ میں اضافہ کرنے یا خریداری سے انکار بغیر کسی وجہ بتلائے کر دیا جائے۔

دستخط
ڈاکٹر محمد ظریف اورکزئی
ایڈمنسٹریٹر، حیات شہید ٹیچنگ ہسپتال
پشاور

INF (P) - 1349

HUSEIN

PAKISTAN'S LEADING
MANUFACTURERS AND EXPORTERS
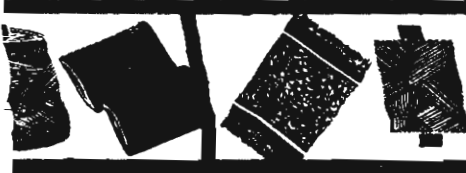
ALITY COTTON
RICS & YARN
USEIN TEXTILE MILLS

COTTON SEWING THREAD &
TERRY TOWELS
JAMAL TEXTILE MILLS

For enquiries for Sheetings, Cambrics,
Drills, Duck, Poplins, Tussores,
Gaberdine, Corduroy, Bed-Sheets, Terry Towels,
Cotton Sewing threads and yarns, please write to :

HUSEIN INDUSTRIES LTD

6th floor, New Jubilee Insurance House,
I. I. Chundrigar Road, P. O. Box No. 5024
KARACHI
Phone : 228601 (5 Lines) Cable "COMMODITY"

اکوڑہ خٹک — رالعلوم حقانیہ — ضلع پشاور پاکستان

اجمالی کارگزاری
دُنیائے علم و فضل کا خراجِ تحسین

...دیث، مولانا عبدالحق مدظلہ، ممبر قومی اسمبلی سابق استاذ اعلیٰ دارالعلوم دیوبند۔ آغاز ابتدائی شعبہ تعلیم القرآن ۱۹۳۷ء بدست شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ شعبہ دارالعلوم حقانیہ ذیقعدہ ۱۳۶۶ھ
...تعلیم طلبا تا حال شعبۂ اطفال بیس ہزار، شعبۂ دارالعلوم بارہ ہزار، مجموعہ بتیس ہزار۔ اخراجات دارالعلوم تا حال تقریباً چالیس لاکھ، سالانہ بجٹ چار لاکھ روپیہ سے زائد۔ نصاب تعلیم مروجہ دارالعلوم دیوبند
...دارالعلوم دو ہزار تقریباً ایک ہزار بیرونی ممالک افغانستان تا سرحدات روس و چین، فضلاء کی اکثریت ملک و بیرون ملک میں تدریس، اہتمام مدارس تبلیغ خطابت، امامت، افواج تعلیم گاہوں وغیرہ میں مصروف ہیں
...تعداد شعبہ اطفال مڈل، ۱۷۱، عملہ ۱۳، مجموعہ ۴۹، تعداد طلبۂ دارالعلوم و شعبۂ ابتدائی گیارہ سو امداد طلبہ طعام و قیام، کتب روشنی ادویہ صابن وغیرہ شعبہ جات دارالافتاء مجموعی جوابات پچیس ہزار، تجوید و قراءت
...ت و تبلیغ شعبہ عربی لسانیات معلم مبعوث الازہر شعبہ تبلیغ، شعبہ تعمیرات، شعبہ محاسبی شعبہ تعلیمات امتحانات، سہ ماہی، ششماہی، سالانہ الحاق وفاق المدارس تعداد دورہ حدیث ۵۰ سالانہ کتب خانہ آٹھ ہزار مطبوعہ،
...سرحد، افواج پاکستان، افغانستان، جامع ازہر میں (اسکالرشپ ۱۹۷۲ء) مستند عطیات انکم ٹیکس سے مستثنیٰ تعمیرات جامع مسجد، دارالحدیث و دفاتر، دارالتدریس، احاطہ مدنیہ، قاسمیہ، مستقلہ، احاطہ اساتذہ،
...و اساتذہ، مدرسہ تعلیم القرآن زیر تعمیر دارالتصنیف۔ ماہنامہ الحق آغاز ۱۹۶۵ء بانی و مدیر مولانا سمیع الحق حلقہ اشاعت برصغیر، مشرق وسطیٰ، یورپ وغیرہ، مقاصد احیاء علوم کتاب و سنت اور نشاۃ اسلام مؤتمر المصنفین

اقتباسات از تحریری آراء مشاہیر علماء پاک و ہند

...مولانا حسین احمد مدنیؒ قلیل مدت میں ترقی مقبولیت خداوندی کی دلیل۔ قاری محمد طیب مہتمم دیوبند، دارالعلوم نے اپنی صورت
...ند کی صورت و سیرت کو سمو لیا ہے اور وہ دارالعلوم دیوبند ہی بن گیا ہے۔ مولانا احمد علی لاہوریؒ، جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو چیلنج کے عنوان سے پاکستان کی گیارہ سالہ زندگی میں اسلام کی جو خدمات ایک علم حضرت
...، کیا آپ سب نے مل کر جو سینکڑوں میں یہاں اتنی کی ہے پاکستان میں کیا حفاظ و بقاء کے سلسلہ میں علماء کرام کا سر بلند نہیں، خدام الدین، اپریل ۱۹۵۹ء خطبہ جمعۃ الوداع مولانا محمد زکریا سہارنپوری مزید ترقیات
...مولانا محمد یوسف دہلویؒ علوم نبویہ کے عمومی و خصوصی فیضان کا ذریعہ۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی اکوڑہ خٹک کا نام ہی میرے لئے بہت کشش رکھتا ہے ۔۔۔۔ یہاں سے ہماری روح اور قلب کا تعلق
...سلسلے کا آغاز ہوا جس کے نتیجہ میں یہ مملکت عطا ہوئی خدا کرے اب علم و قلم کے ذریعہ ان مقاصد کی تکمیل ہو اور اس جسد میں صحیح روح پیدا ہو ۔۔۔۔ بڑی خوشی یہ ہے کہ دارالعلوم حقانیہ سید احمد شہیدؒ کا
...مجاہدین کے قریب ہی ہے۔ مولانا محمد میاںؒ دہلوی الجمعیت، تشنہ لبوں کو علم دین کے آب حیات سے سرشار کرنے۔ مولانا مفتی محمود بجا طور پر پاکستان میں دارالعلوم دیوبند کی نیابت کا مقام، ہدایت
...مینار، عربی علوم کی عظیم درسگاہ، مولانا احسان محمد کندیاں، دارالعلوم دیوبند کا متبادل مولانا غلام غوث ہزاروی پاکستان میں دیوبند عظیم اسلامی کامیاب یونیورسٹی، سرحدی ممالک کے اسلامی مدارس
...سید اللہ انور لاہور، میرے لئے تہذ علمی جس کی فضا اور ہمارے دیوبند کی بو آتی ہے۔ مولانا خیر محمد جالندھریؒ، مولانا محمد علی جالندھریؒ پاکستان میں دارالعلوم دیوبند کی مثالی حیثیت دور ماضی کی یاد اپنی
...ین نور غشتی، میرے بعد خدمت حدیث جاری رہنے کی میری دعاؤں کی تعبیر۔ مولانا نجم الدین اصلاحی مرتب مکتوبات شیخ الاسلام مغربی پاکستان کا جامع ازہر المکتوبات ج ۱ مفتی محمد شفیع دیوبندی
...علوم اللہ تعالیٰ کے انعام کی عملی نشانی۔ مولانا شمس الحق افغانی ہمارے علم میں فقید المثال مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ تائید غیبی کا کرشمہ قاضی سجاد حسین دہلوی اس خطہ کے لئے شمع ہدایت مولانا
...طریق پر دینی تعلیم، طلبہ میں دینی شوق دوسرے مدارس سے بہت زیادہ۔ مولانا محمد اسعد مدنی ہمارے حضرت مدنیؒ کا خاص تعلق تھا۔ مولانا عبدالمالک مجددیؒ ادارہ متبرکہ کی جو گونا ترقیات کا متمنی۔
...ہر محکمہ میں نہایت انتظام تعلیم کے ساتھ روحانی قدر و قیمت مولانا احتشام الحق تھانوی تاریخ میں اس کے کارناموں اور دینی و تبلیغی خدمات کو سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ پیر مانکی شریف
...بے مثال کام۔ پیر دیول شریف، صد ہا تحسین و تبریک، خان عبدالولی خان دیوبند کی روایات اور مولانا حسین احمد مدنیؒ باعمل عالم کا کردار۔ چودھری ظہور الٰہی اس شمع ہدایت و علم دین جاری
...نورانی دور دراز کے طلبہ دیکھنے سے قلبی مسرت، پروفیسر غفور احمد اس کے انتظام اور علم کی خدمت سے بہت متاثر ہوا۔ ابوالکلام محمد یوسف کھلنا تقسیم کے بعد دینی تعلیم کے خلاء کو ایک حد تک
...ہی یہاں حاضری زندگی کا تاریخی دن، اور مدتوں کی آرزوؤں کی تکمیل۔ مولانا کوثر نیازی پاکستان میں وہ حیثیت حاصل کرے گا جو برصغیر میں دیوبند کا ہے۔
...لانا عبدالغفور مہاجر مدینہ، دینی سرچشمہ حیات بہترین نظم و ضبط عظیم الشان نشر گاہ علوم دینیہ۔ علامہ بشیر الابراہیمی الجزائری، قد یوجد في الهند ما لا يوجد في الجزائر قرية اكاد اكون كهيأ مدارس شیخ عبدالفتاح ابوغدہ حلب
...لملة ونظامها الفطري الاسلامي البصير وتوجيه اساتذتها البدور الصدور شیخ الازہر الدکتور فحام زرنا و سرنا كثيرا ما تقوم به من خدمة الاسلام واللغة العربية۔ سفیر الجمهورية العربية الليبية يستحق كل
...مجهود كبير في طلب العلم الوفد الليبي والمراكشي وجدنا فيه الشيء الذي يسر الخاطر الوفد التعليمي السعودي سرنا ما شاهدناه بهذه الدار الكريمة ابلغ الاثر في مثل هذا الموقع الوفد الصحفي السعودي المجهود
...الدين اخبار فردا تہران از مراکز علوم اسلامی پاکستان ایرانی وفد مثل خود ثانی نہ دارد محمد حسین تسبیحی ایرانی برائے دنیائے اسلامی باعث افتخار محمد ابراہیم مجددی علا شور بازار افغانستان
...غنیمت عظمی اخبار المدینہ زیارتنا لهذه المدرسة قلقلت في نظرنا زيارة اي شي آخر